مکمل ناول

زیست صبح صبا ہے

تنزیلہ ریاض

یہ نومبر کی ایک خنک صبح کا منظر تھا۔ زندگی کہیں کہیں بیدار ہونا شروع ہو چکی تھی۔ فجر کی اذان و جماعت ہوئے "تقریباً" آدھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ شاہ خورشید کی نرم و گرم مہربان رو پہلی کرنیں اپنی بانہیں پھیلائے زمین سے معانقہ کرنے کے لیے اپنے مسکن سے نکل پڑی تھیں۔ چرند پرند آنکھیں ملتے، انگڑائیاں لیتے محنت مزدوری کے لیے چل پڑے تھے۔ چہار جانب چھائے سکوت کو پرندوں کی کھلکھلاتی، چہچہاتی آوازیں توڑ ڈالتیں تو عجیب فسوں پیدا ہو جاتا جو نا صرف سننے والوں کو بلکہ دیکھنے والوں کو بھی مسحور کر رہا تھا۔ صبح خیزی و چہل قدمی کے بہت سے عادی لوگ قریبی پارکس کا رخ کر چکے تھے۔ وہ دونوں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر جاگنگ کے لیے پہنچ چکے تھے۔

وہ چالیس بیالیس سال کا صحت مند، توانا اور وجیہہ شخص تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سا وقار تھا، ایسا وقار جو کامیاب... بہت کامیاب لوگوں کی چال میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی کنپٹیوں پر ہلکی ہلکی سفیدی اس کی شخصیت کی کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔ گرے لوئر اور وائٹ اپر میں اس کا توانا وجود اسے اس کے پیچھے آنے والے انیس سالہ لڑکے سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک ظاہر کر رہا تھا۔ وہ لڑکا سیاہ رنگ کے ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور بال سیاہ تھے۔ پہلی دفعہ دیکھنے والوں کو بھی اس کی جاگنگ کی جان بوجھ کر کی گئی کم رفتار کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی صبح سویرے جگا کر جاگنگ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ آگے والا ادھیڑ عمر شخص ہر ملنے والے شخص کو سر کے اشارے سے سلام کر کے آگے بڑھ جاتا جبکہ پیچھے والا نا صرف سلام کرتا بلکہ احوال بھی دریافت کرتا شاید اسی لیے اس کی رفتار قدرے کم تھی۔

"ہیو۔" نوجوان نے اپنے آگے جاگنگ کرنے والے شخص کو سلام کرنے کے بعد اس طرح مخاطب کیا تھا اسے شاید یکدم ہی احساس ہوا تھا کہ وہ نوجوان ہو کر جاگنگ میں پیچھے ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

"میں اسفند ہوں۔" وہ اس کے بالکل قریب آ کر بولا۔

"یور گڈ نیم پلیز؟"

"خضر الاسلام۔" ادھیڑ عمر شخص نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔

"وعلیکم السلام... وعلیکم السلام۔"

اس شخص کے نام کا کبھی کسی نے اس طرح مذاق نہیں بنایا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔

"آپ شاید ہر روز یہاں جاگنگ کے لیے آتے ہیں۔" اسفند نامی اس لڑکے نے پھر مخاطب کرنے کا بہانہ ڈھونڈا۔

"جی تقریباً"... ہر روز۔" وہ شخص تحمل سے بولا تھا۔

"میں بھی ہر روز یہاں آتا ہوں۔" اس نے بتیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں پچھلے بیس سال سے جاگنگ کر رہا ہوں۔" وہ شخص نخوت سے بولا۔ اسفند کی آنکھوں میں تحیر ابھر آیا۔

"پچھلے... بیس سال سے۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولا۔

"جی بالکل پچھلے بیس سال سے۔" اس شخص نے سابقہ انداز میں کہا۔

"ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکے؟" ایسے کہتا بالکل ہونق لگ رہا تھا وہ۔

"واٹ ربش... میرا مطلب تھا پچھلے بیس سال سے میں ہر روز صبح کے وقت یہاں جاگنگ کے لیے آتا ہوں۔" وہ دوڑتے ہوئے بول رہا تھا۔ وہ دونوں اب اکٹھے جاگنگ کر رہے تھے۔

"اوہ... اچھا اچھا۔"

"اس حساب سے آپ کی عمر پچاس کے لگ بھگ تو ہو گی۔ ویسے آپ اتنے بوڑ... میرا مطلب بڑے دکھائی نہیں دیتے۔"

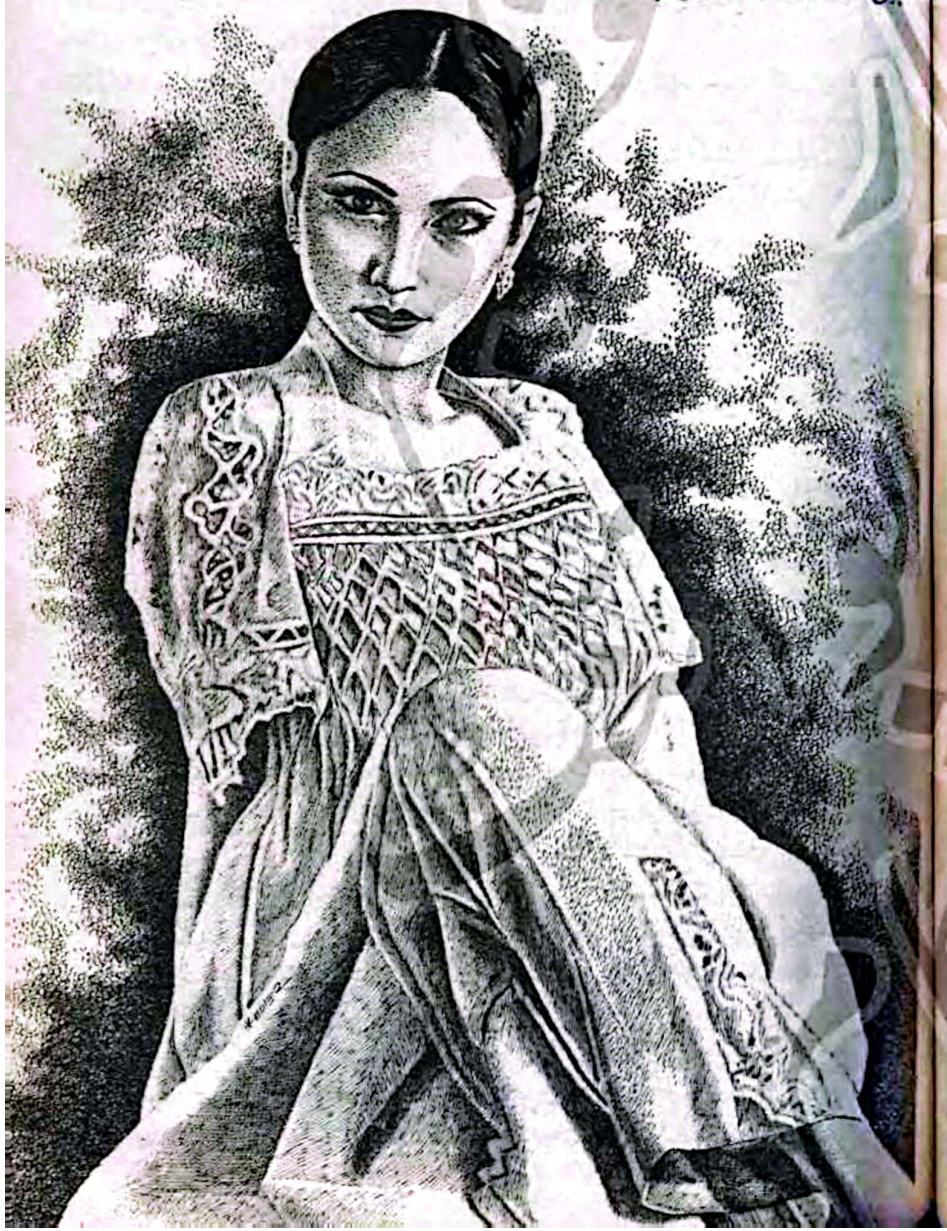

وہ بوڑھا کہتے کہتے رک گیا لیکن خضر نامی اس شخص کو غصہ آگیا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ میری عمر کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ میں پچاس سال کا ہوں یا دو سو پچاس سال کا' آپ کو اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اوہ آئی ایم ساری' آپ کو برا لگا شاید ویسے میں نے تو کمپلیمنٹ دیا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا۔

"اتنا غصہ تو کبھی ایلزبتھ ٹیلر نے بھی عمر کے متعلق سوال پوچھنے پر نہیں کیا ہوگا۔"

اسے اب ستانے میں مزا آنے لگا تھا۔

"اس لیے کہ میں ایلزبتھ ٹیلر نہیں ہوں۔" وہ شخص غصے سے بولا۔

"ارے آپ ایلزبتھ ٹیلر کیسے ہو سکتے ہیں آپ کی مونچھیں تو ابھی سیاہ ہیں۔" گویا ایلزبتھ کی مونچھیں سفید ہو چکی ہوں۔

اس بات پر اس شخص کے چہرے پر ذرا کی ذرا مسکراہٹ پھیلی لیکن اس نے کمال مہارت سے اس کو چھپا لیا۔

"آپ کرتے کیا ہیں؟" خاموشی کے ننھے سے وقفے کو اس کی آواز نے پھر توڑ ڈالا۔

"ٹین ڈبے بیچتا ہوں۔" وہ جل کر بولا تھا۔

"واؤ... زبردست... میرے ابا بھی یہی کام کرتے ہیں' لیکن ہمارا گزارہ نہیں ہوتا اس کاروبار میں۔"

وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر آپ کے ابا پارٹ ٹائم میں ڈاکے ڈالتے ہوں گے۔"

خضر کا انداز ابھی بھی جلا کٹا تھا۔

"ارے نہیں ابا اتنے ذہین و نڈر کہاں... سنڈے کے سنڈے ڈنڈے پر غبارے لگا کر بیچتے ہیں گلی گلی... آمدنی تو اس کام میں بھی نہایت قلیل ہے لیکن..."

وہ پر تاسف انداز میں کہتا کہتا رک گیا۔ اس کے ساتھ دوڑتے شخص کو یکدم زور کا غصہ آیا تھا۔

"ہاں... ہاں اب کہہ دو کہ آج تک تمہارے باپ نے تمہارے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی آج تمہارے پاس ہے تمہاری اپنی محنت و مشقت کا صلہ ہے۔"

اس نے لڑاکا عورت کی طرح ہاتھ نچا کر کہا۔ اس کی سانس پھولنے کی وجہ سے اس کی رفتار نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ اسفند کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں وہ سب تو ٹھیک ہے... لیکن آپ کو غصہ کیوں آگیا؟"

وہ لہجے میں مصنوعی حیرانگی پیدا کر کے بولا۔

"جی نہیں... مجھے غصہ نہیں آیا۔" وہ شخص ہانپتے ہوئے بولا۔

"آپ کو غصہ بھی آرہا ہے اور آپ کی سانس بھی پھول رہی ہے... اسی لیے آپ کی رفتار بھی کم ہو گئی ہے۔"

اسفند کی بات پر اس نے رفتار تیز کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کا تنفس کافی تیز ہو چکا تھا جس کا اثر اس کی جاگنگ کی رفتار پر پڑا تھا۔

"اسفند کے بچے۔" وہ چلایا۔ اس نے رک کر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور تیز تیز سانس لینے لگا۔ اسفند اس دوران کافی آگے نکل چکا تھا۔ واپس دوڑتا ہوا پھر اس کے پاس آگیا۔

"جی اسفند کے بچے... آپ کے پوتے... اب تو مان لیں ڈیڈ' آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں نے آپ کو پھر ہرا دیا۔"

وہ مزا لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"جی نہیں... یہ فاؤل ہے۔ تم اگر یوں بیچ میں مجھے مخاطب نہ کرو' مجھے مسلسل بولنے پر مجبور نہ کرو تو میرا سانس کبھی نہ پھولے اور میں کبھی نہ ہاروں۔"

وہ دونوں ہی رک گئے تھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ واپسی کا ٹائم ہو چلا تھا۔

"آپ مجھے چیلنج ہی کیوں کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں مجھے جیتنے کے ٹرکس آتے ہیں۔"

وہ واپس جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چلو' اب یہ اپنے باپ کے سامنے پھنے خان بننے کی کوشش نہ کرو۔"

خضر اسے چڑاتے ہوئے بولا' اسفند ہنس دیا۔ وہ دونوں گیٹ کراس کر کے گاڑی تک آ گئے۔

"مے آئی ڈرائیو یور کار سر!" وہ ایک ہاتھ سینے پر باندھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

"وائی ناٹ مسٹر شوفر!"

خضر نے چابی اسے تھما کر بہت نزاکت سے کہا۔ ایک بار پھر وہ دونوں ہنس دیے تھے۔

اس کی ریش ڈرائیونگ کی بدولت پچیس منٹ کا راستہ دس منٹ میں طے کر کے وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ خضر لان میں رک کر مالی کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگے جبکہ اسفند ڈائننگ روم کی طرف آگیا تھا اسے ابھی اپنی دو سالہ بہن کو اسکول چھوڑنے جانا تھا۔ زینب ماوئی کو ناشتا کروانے میں مصروف تھی۔ ماوئی پلے گروپ میں تھی۔ اس نے ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا اس لیے وہ کافی اکتائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ بالوں کو چھوٹی چھوٹی دو پونیوں میں مقید کیے' صاف ستھرے کپڑے پہنے وہ کافی کیوٹ لگ رہی تھی اسفند نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے بھائی کے اس والہانہ اقدام پر ناک چڑھائی۔ اسفند نے اس کے گال پر پیار کیا تو اس کی ناک اور بھی چڑھ گئی۔

"ارے میری پرنسز کو کیا ہوا؟ اتنے غصے میں کیوں ہے؟"

اس نے اس کے ہاتھ چومتے ہوئے زینب سے استفسار کیا جو دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اسفند مسکرایا پھر اسے دیکھ کر بولا۔

"ڈیڈ لان میں کھیتی باڑی کے لیے رک گئے ہیں۔"

زینب جھینپ سی گئی۔ چاہے سوتیلا سہی تھا تو وہ اس کا بیٹا' جبکہ اسفند کو ایسی باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اپنے باپ سے بھی بے حد بے تکلفی تھی اور زینب اور اپنی عمر کے بیچ چند سالوں کے فرق کو وہ کبھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے' اپنے اور اس کے بیچ رشتے کی نزاکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اس کے نام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ وہ زینب کو سوتیلی ماں سمجھتا تھا نہ ماوئی کو سوتیلی بہن' بلکہ ماوئی سے تو اسے عشق تھا۔

"میری جانو کا موڈ کیوں آف ہے؟" وہ ایک بار پھر اس کا گال چوم کر پوچھنے لگا۔ ماوئی نے اپنے گال پر ہاتھ پھیر کر کسی نادیدہ چیز کا اثر زائل کرنا چاہا تھا۔ اسفند کو سمجھ میں آگیا کہ اس کے چہرے اور لبوں کے بالائی حصے پر موجود ننھے' کھردرے بال ماوئی کو تنگ کر رہے ہیں۔ بہن کی اس ادا پر وہ مسکرایا پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"اوہ سو سوری جانو۔" وہ اسے دوبارہ اس کی جگہ پر بیٹھا کر اندر کی سمت چل دیا تاکہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ماوئی کو اسکول چھوڑنے جا سکے۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی۔" وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہونے ہی لگا تھا جب عجلت بھری یہ آواز کانوں میں پڑی' اس نے مڑ کر دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا کافی پریشان اور اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ اسفند کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی ایک ننھا سا اسکول بیگ تھا اور بائیں ہاتھ کی انگلی ایک بچے نے پکڑ رکھی تھی۔ بچے کا حال باپ سے بھی برا تھا۔ بغیر استری شدہ یونیفارم' گندے جوتے' بکھرے بال' اسفند نے ماوئی اور اس کا تقابلی جائزہ لے کر دل ہی دل میں بچے کی ماں کے "سگھڑاپے" کو داد دی۔

"جی فرمایئے۔" اس نے سن گلاسز اتار کر سر پر ٹکاتے ہوئے شائستگی سے کہا۔ ماوئی اس کی انگلی تھامے اس بچے کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میرا بیٹا کے جی ٹو میں پڑھتا ہے۔ آپ اسے اندر تک چھوڑ دیں گے دراصل میری گاڑی خراب ہے۔ مجھے گھر واپس پبلک ٹرانسپورٹ سے جانا ہے اور... اور میری بہت ضروری میٹنگ ہے۔"

CamScanner

"اوہ شیور۔۔۔ وائی ناٹ۔" اس کی لجاجت بھری آواز سے متاثر ہو کر اسفند نے کہا۔

"پاپا!" بچے کے حلق سے سسکتی ہوئی آواز نکلی۔ اس شخص نے بہت بیچارگی سے بچے کی طرف دیکھا پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"پلیز شیری! بیٹا! پاپا کے پرابلم کو سمجھنے کی کوشش کرو جان۔ بہت ضروری میٹنگ ہے۔ میں۔۔۔ میں کل آپ کی ٹیچر سے مل لوں گا۔ آئی پرامس سونو! آئی رئیلی پرامس۔"

اسفند اور ماوی کھڑے باپ بیٹے کی اس میٹنگ کو دیکھ رہے تھے۔ باپ کی بات پر اس بچے کی موٹی موٹی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر گالوں پر پھسلے۔ اس نے شوں کرتے ہوئے خود کو مزید رونے سے روکا تھا پھر چپ چاپ باپ کا ہاتھ چھوڑ کر اسفند کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ شخص ممنون نظروں سے اسفند کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کی تھکن میں اضافہ ہو چکا تھا۔

"یو ڈونٹ وری مسٹر۔۔۔" وہ اس شخص کا نام جاننے کے لیے رکا۔

"داؤد رضا۔" اس شخص نے اب کی بار بھی عجلت سے کہا۔

"جی مسٹر داؤد رضا! میں شیری کو چھوڑ دوں گا۔"

اس کا اتنا کہنا تھا وہ شخص تیز تیز چلتا سڑک عبور کر کے دوسری سمت میں ہو گیا۔ اسفند نے اس کے اس اقدام کو قدرے ناپسندیدگی سے دیکھا۔ پھر بچے کی سمت دوستانہ مسکراہٹ اچھال کر بولا۔

"شیری بیٹا! کون سی کلاس میں پڑھتا ہے؟"

"کے جی ٹو۔" وہ جھکی جھکی گردن سے کہہ رہا تھا اس کے انداز میں باپ کے لیے بے پناہ شکایت تھی۔

"یہ تون ہے لالہ۔" ماوی نے اپنی توتلی زبان میں اسفند سے پوچھا۔

"یہ شیری ہے جانو!" وہ اس کے ننھے ہاتھ میں اپنی انگلی تھما کر بولا۔ شیری نے پژمردگی سے اس کی انگلی تھام لی پھر آہستہ سے بڑبڑایا۔

"شیری نہیں۔۔۔ شہریار۔" وہ عمارت کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

"شیلی نہیں۔۔۔ شیل یال۔" ماوی کو بات دہرانے کی عادت تھی اسفند ہنس دیا پھر بولا۔

"جی شیل یال۔۔۔ اب آپ خاموش ہو جایئے اور جلدی سے پہلا کلمہ سنایئے آپ کا کلاس روم آگیا ہے۔"

اس کے کلاس روم کے آگے رک کر وہ اس کا بیگ اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ننھی ماوی نے جلدی سے کلمہ سنا کر بھائی کے گال پر پیار کیا پھر ننھے ننھے قدم اٹھاتی اندر کی سمت چل دی۔ شہریار کی نظروں میں عجب یاسیت در آئی تھی۔ اسفند نے بہت پیار سے اسے دیکھا۔ جانے کیوں وہ بچہ اسے اپنے بچپن کی یاد دلا رہا تھا۔ اس کی ماں کا انتقال ہوا تو وہ بمشکل تین سال کا تھا۔ خضر اسے اکثر اس حلیے میں اسکول چھوڑ جایا کرتے تھے جیسے شہریار کو اس کا باپ چھوڑ گیا تھا اور وہ بھی ایسی ہی یاسیت اور محرومی کے احساس سے دوسرے بچوں کو دیکھ رہا ہوتا تھا جیسے شہریار نے ماوی کو دیکھا تھا۔

"کے جی ٹو میں پڑھنے والے بچے بہت بریو ہوتے ہیں۔ وہ پاپا کو تنگ نہیں کرتے۔ وہ ان کے پرابلمز کو سمجھتے ہیں۔ ہیں نا؟"

اس نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ شہریار خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"بریو بچے روتے بھی نہیں۔۔۔ ہیں نا۔" وہ پھر بولا جواب میں پھر خاموشی۔

"بریو بچے اداس بھی نہیں ہوتے۔" اس نے پھر شہریار کو مخاطب کیا لیکن جواب ابھی بھی ندارد۔ کے جی ٹو کے کلاس روم سے فاصلہ تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔

"شہریار!" اس نے رک کر کہا۔ بچے نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر بولا۔

"اسے پہلا کلمہ کس نے سکھایا؟"

"کسے؟" اسفند سمجھا نہیں۔

"اسے۔" وہ انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بولا تو اسفند کو سمجھ میں آگیا۔

"ماوی کو؟"

"ہاں۔" اس نے منہ لٹکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ ماوی ہے Playing Section میں ہے۔"

"اس کو کلمہ کس نے سکھایا؟" شہریار کو صرف اس بات سے غرض تھی۔

"میں نے سکھایا۔ کیوں؟ آپ کو نہیں آتا کیا؟" اسفند اس کے قدموں میں بیٹھ کر بولا۔ شہریار کے تسمے کھل چکے تھے۔ اس نے انہیں باندھنا شروع کیا۔

"آپ کو کلمہ نہیں آتا؟" اس کے خاموش رہنے پر اسفند نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے صرف نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

"او کے۔۔۔ ڈونٹ وری' آپ اپنی ممی سے کہنا' وہ آپ کو سکھا دیں گی۔"

وہ اس کے گال سہلا کر بولا۔

"ممی کہاں سے آئیں گی؟ وہ تو مر گئیں۔"

وہ اتنی بڑی بات نہایت معمولی انداز میں بتا رہا تھا اسفند شاکڈ رہ گیا۔

"وٹ؟ ممی۔۔۔ نہیں ہیں؟" اسے شہریار کے بگڑے حلیے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔

"نہیں۔" شہریار کے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل زمین کو گھور رہا تھا۔ اسفند نے اسے کھینچ کر سینے سے لگایا۔

"سو سویٹ۔۔۔ سو انوسینٹ۔" وہ بڑبڑایا تھا پھر اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں میں آپ کو کلمہ سکھا دوں گا۔"

"او کے۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"آپ مجھ سے دوستی کرو گے؟" اسفند نے یکدم پوچھا۔

شہریار نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا گویا کہنا چاہتا ہو۔ اتنا بڑا دوست پھر کندھے اچکا کر بولا۔

"پاپا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" اسفند کو اس کے انداز پر اور بھی پیار آیا۔

"آپ بھی یہاں پڑھتے ہیں۔" شہریار نے اس سے پوچھا۔

"میں یہاں نہیں پڑھتا۔ میں کالج میں پڑھتا ہوں۔" اسفند اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"پاپا بھی کالج جاتے تھے۔ وہ بہت جینئس ہیں۔ ان کو ٹوینٹی (۲۰) تک ٹیبلز آتے ہیں۔" وہ اپنے باپ کے بارے میں فخریہ انداز میں بتاتے ہوئے پرجوش ہوا۔

"مگر پاپا گندے بھی بہت ہیں۔ روز گندا یونیفارم پہنا دیتے ہیں' ٹیچر پنیش کرتی ہیں۔" وہ منہ لٹکا کر بولا۔ اسفند نے دل ہی دل میں کچھ طے کیا تھا۔

"چلو پھر پہلے تمہاری ٹیچر سے مل کر آتے ہیں۔"

"سچی؟" شہریار خوشی سے بولا۔

"ہنڈرڈ پرسینٹ سچی۔" اسفند نے اس کی انگلی تھامی۔

"میں شہریار کا چاچو ہوں۔" چند لمحوں بعد وہ اس کی ٹیچر کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بارشوں کی قسم
جن کی بوندوں سے مٹی مہکنے لگے
جن کے موسم میں یہ دل بہکنے لگے
جن سے آئے فضاؤں میں اک تازگی
سارے عالم پہ چھائے عجب سرخوشی
جن کے ممنون یہ کھیت یہ گلستان
بارشوں کی قسم
تم تو وہ کچھ ہو جو بارشیں بھی نہیں

کن من کرتی بوندوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بارش کی مناسبت سے یہ نظم خود کو سنا کر خود ہی داد دی تھی۔

ابتدائی سردیوں کی پہلی بارش نے جہاں خنکی میں اضافہ کیا تھا وہاں دن اور رات کے اوقات بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ شام' تین بجے کے قریب ہی اپنے پر پھیلا کر آنگنوں میں پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ چائے کی شدید

طلب کو دباتے ہوئے وہ گھر کے پچھلی جانب بنے بڑے سے صحن میں آ بیٹھی۔ اکیلے چائے پینا اسے بہت برا لگتا تھا اور چائے کے اوقات میں اکثر وہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔ خضر آفس میں جبکہ اسفند ماوئی کو لے کر قریبی پارک میں جایا کرتا تھا۔ آج بارش بھی ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے اپنی سوزوکی میں گھمانے لے گیا تھا۔

"اسفند آجائے تو پھر چائے بناؤں گی۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔ کھلکھلاتی اٹھکیلیاں کرتی ہوا اس کے پاس سے گزری اور خنکی کا احساس چھوڑتی آگے بڑھ گئی۔

"کاش میں اس بارش میں بھیگ سکتی۔" اس کے دل میں بہت زور کی خواہش جاگی تھی لیکن وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتی تھی خضر کو صحت کے معاملے میں لاپرواہی سخت ناپسند تھی۔ وہ صحن اور گھر کو ملانے والے برآمدے کے اسٹیپ پر آ بیٹھی یہ حصہ شادی کے بعد خضر نے خاص طور پر اس کی فرمائش پر تعمیر کروایا تھا۔ اس سے پہلے یہ حصہ گھر سے ملحق ایک گراؤنڈ تھا۔ زینب کی فرمائش پر اس کے گرد باؤنڈری وال بنوائی گئی تھی۔ چاروں جانب کیاریاں تھیں اور بیچ کا سارا حصہ سرخ اینٹوں کے فرش پر مشتمل تھا جو بارش کے پانی سے دھل کر بہت نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔ اس صحن کا آدھا حصہ کچن گارڈن کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ آرائشی پھول پودوں کی بجائے اس نے یہاں ضرورت کی سبزیاں اگا رکھی تھیں یہ اور بات تھی کہ وہ یہ سبزیاں پکا نہیں سکتی تھی کیونکہ خضر اور اسفند دونوں کو سبزی کے نام پر صرف آلو پسند تھے۔

بارش میں تیزی آگئی تھی۔ سردی کچھ کچھ ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔ کبھی کبھی اتنے بڑے گھر میں افراد کی کمی اسے بے حد محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی سارے گھر میں صرف ایک ملازم تھا اور وہ تھی۔ ملازم بھی چودہ پندرہ سال کا لڑکا تھا۔ جو باہر کے کاموں کے لیے کچھ عرصہ پہلے ہی رکھا گیا تھا۔ اس نے ٹی وی آن کر کے چینل بدلنے شروع کر دیے۔ مگر اس کام میں بھی زیادہ مزا نہ آسکا۔

وہ اکتا کر کچن میں آگئی اور چار بجے ہی ڈنر کی تیاری کا آغاز کر دیا۔

"یعنی کہ حد ہو گئی۔ اب بوریت سے بچنے کے لیے انسان ہانڈی پکانا شروع کر دے۔"

چکن کڑھائی کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن کی صبح رات بھر ہونے والی بارش کی بدولت کافی سے زیادہ سرد تھی بھرپور بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا۔ باغات نہا دھو کر نکھر گئے تھے جبکہ سڑکیں اور راستے مصیبت میں آگئے تھے۔ ایسے میں ان دونوں باپ بیٹوں کو ڈرائیونگ سے چڑ ہوتی تھی اس لیے خضر نے لیٹ آفس جانے کا عندیہ ظاہر کر کے دوبارہ لحاف میں پناہ لے لی تھی۔ ماوئی کا اسکول تھوڑا لیٹ اسٹارٹ ہوتا تھا اس لیے زینب نے اسے بھی نہیں جگایا تھا۔ نماز و قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر وہ لان میں آگئی۔

اسفند ایکسرسائز میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے دور ہی سے ہاتھ ہلایا تھا۔

زینب مسکرا کر بارش کی تباہ کاریوں کا جائزہ لینے لگی۔ پھول، پودے سب ہی سر جھکائے سردی کو کوسنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف بڑے سے پنجرے میں قید مور، مورنی کا جوڑا بھی سردی کی وجہ سے کافی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ آسٹریلین طوطوں اور موروں کا دانہ دنکا کا جائزہ لے کر اطمینان کرنے کے بعد اس نے شال کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا پھر ایک کرسی پر آ بیٹھی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر اسفند مصروف تھا۔ اس نے ہاف سلیوز والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اتنی سردی میں اسے آدھے بازو والی قمیص میں دیکھ کر زینب کو جھرجھری سی آگئی۔

"اسفند! سردی نہیں لگ رہی۔" اس نے پوچھ لیا۔

اسفند نے نفی میں سر ہلا کر اسے تسلی دی تھی پھر

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کے پاس آگیا۔

"گڈ مارننگ میم!" تولیے سے پسینہ پونچھ کر اس نے اسے کرسی پر ڈال دیا تھا۔

"مارننگ۔" زینب نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ کے پھول، پودوں نے خوب شاور لیا رات بھر۔" اس نے لان میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

زینب ایک بار پھر مسکرا دی۔

"ڈیڈ سو رہے ہیں ابھی تک؟" ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے استفسار کیا۔

"ہاں۔۔۔ کہہ رہے ہیں لیٹ آفس جاؤں گا۔"

"زینب! ڈیڈ کچھ زیادہ ہی سست نہیں ہو گئے۔ جاگنگ کے لیے پارک نہیں گئے تو انسان لان میں ہی ایکسرسائز وغیرہ کر لے۔ بہت لاپرواہی برتنے لگے ہیں۔" اس کے تشویش زدہ لہجے پر زینب کو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ دونوں باپ بیٹا ایک دن کی غفلت ہو جانے پر بھی ایک دوسرے کو اسی طرح مورد الزام ٹھہرایا کرتے تھے۔

"وہ کہہ رہے تھے ایسے موسم میں لان میں کھڑے ہو کر ایکسرسائز کرنے کا مطلب ہے نزلہ، زکام کے دائرس کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرانا۔"

زینب نے خضر کے الفاظ کو من و عن دہرایا۔

"بہت خوب یعنی کہ بہت ہی خوب۔ یہ سب بڑھاپے کی نشانیاں ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ زینب کو ہنسی آگئی تھی۔

"تم سمجھاؤ نا ان کو۔" وہ بولی تھی۔

"ارے تو آپ کو کس لیے لائے ہیں ہم؟ اسی لیے کہ آپ ہمارے اولڈ مین کو سنبھال سکیں۔۔۔ ان کو سمجھا سکیں۔"

وہ زینب کی بات کا مزا لیتے ہوئے بولا۔ زینب کو سمجھ نہ آئی وہ اس بات کا کیا جواب دے۔

"اسفند! میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ تمہارے لیے ایک کال تھی۔"

اسے ایک دم ہی یاد آیا۔

"میرے لیے؟ کس کی۔۔۔؟"

"کوئی رضا۔ داؤد رضا صاحب تھے۔ میں اصل میں کچن کے کاموں میں بھول ہی گئی۔ انہوں نے کہا تھا وہ دوبارہ کال کریں گے۔"

وہ اسے تفصیل بتانے لگی۔ اسفند کو یاد نہ آیا کہ داؤد رضا صاحب کون ہیں۔

"کوئی میسیج نہیں دیا انہوں نے؟" وہ یادداشت پر زور دینے کے ساتھ اس سے پوچھنے لگا۔

"ایسا کوئی خاص میسیج تو نہیں دیا۔ بس کہہ رہے تھے تم کو تھینکس بولنا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب یاد آیا۔ کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں دیا انہوں نے۔"

اسے یاد آگیا تھا کہ داؤد رضا صاحب کون ہیں۔ شہریار کی ٹیچر سے مل کر اس نے خود ہی اپنا فون نمبر اسے دیا تھا اور خاص تاکید کی تھی کہ اپنے پاپا سے کہنا مجھ سے بات کر لیں۔

"نہیں۔۔۔ نمبر تو کوئی نہیں دیا۔ کیوں؟ کوئی اہم شخصیت ہیں یہ صاحب۔"

اس کو سوچ میں گم دیکھ کر زینب نے پوچھا۔

"وہ شہریار کے متعلق بتایا تھا نا آپ کو۔۔۔ اسی کے والد محترم ہیں یہ داؤد رضا صاحب میں نے شہریار کی ٹیچر سے ملاقات کی تھی بس اسی کے متعلق بتانا تھا نا ان کو۔"

اسفند نے اسے تفصیل سے بتایا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ان سے بات نہ کرنے کا بہت افسوس ہو۔

"چلو ضروری سمجھیں گے تو دوبارہ کر لیں گے۔" زینب نے تسلی دی۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ ورنہ میں دوبارہ اسکول میں شہریار سے مل کر ان کا نمبر لے لوں گا۔ مجھے وہ بچہ بہت اچھا لگا تھا۔ دل چاہتا ہے اس کی مدد کرنے کو۔" وہ بولتے بولتے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ناشتے کے متعلق کیا خیال ہے؟" زینب نے بھی اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"خیال تو بہت نیک ہے۔۔۔ یون کرتے ہیں آج پراٹھا اور آملیٹ کا ناشتا کرتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر زینب کچن کی طرف آگئی تھی۔ انڈہ' پراٹھا اسفند کا بہت اسپیشل قسم کا ناشتا ہوتا تھا اور زینب اس ناشتے کی تیاری میں تمام لوازمات استعمال کیا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا ایک دم فضول آدمی ہیں تم کو پتا ہے آج انہوں نے میرا ناشتا جلا دیا۔"

وہ اپنا لنچ بکس کھول کر اپنے ساتھ بیٹھے بچے کو بتا رہا تھا۔ اسفند نے ذرا سا سر اٹھا کر لنچ بکس دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی شہریار نے لنچ بکس بند کر دیا۔

"آج میں تمہارا لنچ کروں گا۔ تم کیا لے کر آئے ہو۔"

وہ اپنے دوست کے ہاتھ میں پکڑے سینڈوچ کو گھورتے ہوئے بولا۔

"یہ سینڈوچ ہے۔۔۔ ممی نے دیا تھا۔" وہ گپلو سا بچہ سینڈوچ کا بڑا سا بائٹ لے کر بولا۔ شہریار کی نظروں میں ندیدہ پن بڑھتا جا رہا تھا۔ موٹا بچہ کسی صورت اپنا سینڈوچ شیئر کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"ممی نے کہا تھا صرف تم کھانا کسی اور کو مت دینا۔۔۔ آئی ایم سوری شہریار۔" اس نے تین نوالوں میں سینڈوچ ختم کر دیا۔

"موٹا۔۔۔ آلو۔۔۔ گینڈا۔" شہریار اس کے کندھے پر مکا مارتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اسفند جو کب سے اسے دیکھ رہا تھا اسے پکار بیٹھا۔

"شیری۔" اس نے مڑ کر دیکھا۔ اسفند کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شناسائی کی رمق ابھری جو دیکھتے ہی دیکھتے اپنائیت میں ڈھل گئی۔

"آپ۔۔۔" وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا تھا۔ اسفند نے نیچے بیٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔ وہ خاص طور سے اسی سے ملنے اس ٹائم اسکول آیا تھا۔ ہفتہ' اتوار کو ماؤی کی چھٹی ہوتی تھی اس لیے وہ گھر میں تھی۔

اسکول میں بریک ٹائم چل رہا تھا اس لیے اسفند اسے ڈھونڈتا ہوا لان میں آگیا تھا۔

"تم تو بہت بے وفا نکلے ماسٹر' تم نے فون ہی نہیں کیا۔"

وہ اسے گود میں اٹھا کر بولا۔ شہریار کے انداز میں اس کے لیے بے پناہ اپنائیت اور دوستی تھی حالانکہ پہلی ملاقات کے بعد آج یہ ملاقات تقریباً" دس پندرہ دن بعد ہو رہی تھی۔ گزشتہ تمام دنوں میں اسفند نے داؤد رضا کے فون کا انتظار کیا تھا مگر وہ صاحب شاید بھول گئے تھے۔ ماؤی کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے بھی اس نے دوبارہ انہیں نہیں دیکھا تھا۔

"آپ مجھے کلمہ سکھانے آئے ہیں نا۔" وہ اس کی گود میں چڑھا مزے سے بولا۔ اسے ساری باتیں یاد تھیں۔ اسفند کو ہنسی آگئی۔

"نہیں ننھے فرشتے! میں آپ سے کلمہ سیکھنے آیا ہوں۔"

وہ اس کے گال پر پیار کر کے بولا۔

"سنو۔" اس نے پھر اسے پکارا۔ وہ گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ کافی صحتمند بچہ تھا۔ اس کے گالوں پر سرخی سی تھی جو اسے اور بھی کیوٹ بناتی تھی۔ اسفند کو اس کے اس طرح دیکھنے پر اور بھی پیار آیا۔

"بہت بھوک لگی ہے۔"

"ہاں نا۔" وہ معصومیت سے بولا۔ اسفند اسے لے کر کینٹین آگیا۔ اس کے لیے سینڈوچ اور جوس لے کر وہ دونوں وہیں بیٹھ گئے تھے۔ بریک ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

"میں نے پاپا سے پوچھا تھا کہ میں آپ سے دوستی کر لوں؟" وہ کھاتے ہوئے بولا۔

"پھر۔۔۔ پاپا نے کیا کہا؟"

"انہوں نے کہا۔۔۔ شیری جانو! وہ آپ سے بہت بڑے ہیں۔ کسی کو تنگ کرنا بری بات ہے۔"

اسے شاید خود بھی اپنے باپ کی بات پسند نہیں آئی تھی اس لیے ناک چڑھا کر کہہ رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے۔" اسفند کچھ سوچتے

ہوئے بولا۔

"ایک بات بتاؤ پارٹنر! کیا پاپا شروع سے ہی ایسے ہیں۔"

"کیسے؟" شہریار کی ساری توجہ کھانے کی چیزوں کی طرف تھی۔

"گندے اور۔۔۔"

"میرے پاپا گندے نہیں ہیں۔" وہ ایک دم سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے' یہ جو گندا یونیفارم آپ کو پہناتے ہیں اور جوتے پالش نہیں کرتے پھر ناشتا بھی جلا دیتے ہیں۔ کیا یہ سب شروع سے ہی ایسا ہے۔"

وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں نا' پہلے تو کبھی ایسا نہیں تھا۔ پہلے تو اسلم ناشتا بناتا تھا' کپڑے بھی وہی پریس کرتا تھا۔" وہ سینڈوچ ختم کر کے اب جوس پینے لگا تھا۔

"اسلم؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سرونٹ۔" اس نے بھی ایک لفظ میں جواب دیا۔

"اب اسلم کہاں گیا؟"

"اس نے شادی کر لی گاؤں چلا گیا۔" وہ کھا پی کر فارغ ہو چکا تھا۔

"اب کلمہ یاد کریں۔" پیٹ بھر چکا تھا اور دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"کلمہ بھی یاد کریں گے آج نہیں پھر کسی دن۔۔۔ ابھی تو بریک ختم ہونے میں صرف دو منٹ ہیں۔"

اس نے اسے یاد کروایا تو وہ فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ دوبارہ آئیں گے؟" وہ جاتے جاتے مڑ کر بولا۔

"آپ انتظار کرو گے میرا؟ مجھے دوبارہ آنا چاہیے۔" اسفند نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں ضرور آؤں گا۔"

شہریار اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کلاس روم کی جانب چل دیا تھا۔ اسفند واپسی کے لیے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ کلمے والے انکل۔۔۔ کلمے والے انکل۔"

وہ اپنے سامنے بکھری رنگ برنگی ٹی شرٹ کو چھوڑ کر اس کی انگلی پکڑ کر گھسیٹنے لگا تھا۔ ایک لمحے کو تو داؤد سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے پھر جب اس نے دوبارہ کلمے کا حوالہ دیا تو وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ شہریار نے اسے اپنی اور اسفند کی اسکول میں ہونے والی دوسری ملاقات کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔ اسے پہلے ہی کافی شرمندگی تھی کہ وہ ان صاحب کا شکریہ ادا نہیں کر سکا اور اس دوسری ملاقات نے اس کی شرمندگی میں کافی اضافہ کیا تھا۔ شہریار نے اسے یوں بھی وارننگ دی تھی۔

"پاپا! آپ نے میرے دوست کو فون کر کے تھینکس نہیں بولا تو بس میں تو۔۔۔ بس میں۔" اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ کیا دھمکی دے۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا تھا۔

"تو بس میں بھی اسلم کی طرح شادی کر کے گاؤں چلا جاؤں گا۔"

داؤد نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

"اچھا میرے باپ! تسلی رکھو' کر لوں گا فون۔"

شام میں وہ اسے لے کر آؤٹنگ کے لیے نکل گیا تھا۔ شاپ سے اس کے لیے شرٹس دیکھتے ہوئے اس نے انکل' انکل کی رٹ لگا دی تھی۔ داؤد نے تھوڑی ہی دیر میں اسفند کو دیکھ لیا تھا جو گلاس ڈور سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے آیا تھا۔ اس کے ساتھ آج بھی وہی بچی تھی' اس نے پنک رنگ کی فراک پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں اپنا ٹیڈی بیئر اٹھائے وہ بہت تمکنت سے اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی مسٹر اسفند!" اس نے پکارا تھا۔ اسفند نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی

لپک تھی۔

"اسلام علیکم... آخر کار میں نے آپ کو پکڑ ہی لیا۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اسفند کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"وعلیکم اسلام! رضا صاحب خیریت سے تو ہیں آپ۔" وہ ایسے بولا جیسے پرانی جان پہچان ہو۔ سب سے زیادہ خوشی شہریار کو ہو رہی تھی جو پوری بتیسی کی نمائش کیے اسے تک رہا تھا۔

"ہیلو ماسٹر! آپ کیسے ہو؟" اسفند نے اس سے بہت محبت سے ہینڈ شیک کیا تھا۔

"آپ لوگ بھی گھومنے آئے تھے شاید۔" اسفند نے داؤد رضا سے استفسار کیا۔ وہ اسفند اور ماوئی کو حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔

"لگتا ہے اماں ابا نے جلدی شادی کردی تھی۔" داؤد نے دل میں سوچا تھا۔ اسفند اسے دو سالہ بچی کا باپ نہیں لگ رہا تھا۔

"یہ ماوئی ہے۔" اس کی آنکھوں میں تحیر دیکھ کر اسفند نے کہا۔

"اوہ... آپ کی بیٹی... ماشاءاللہ بہت کیوٹ ہے۔ شیری والے اسکول میں ہی ہے نا۔" وہ جلدی سے بولا تاکہ کچھ دیر پہلے پیدا ہونے والا تاثر زائل کر سکے۔

"جی... ابھی Playing seation میں ہے۔"

وہ دونوں ہی اپنے اپنے بچوں کی انگلیاں تھامے اب سندباد کی سمت میں چل رہے تھے۔

"ان فیکٹ' میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ سے دوبارہ ملاقات ہی نہ ہو پائی۔ میں نے کال کیا تھا آپ کے گھر... آپ کی مسز سے بات ہوئی تھی۔ آپ گھر نہیں تھے۔"

اس نے خود ہی فرض کرلیا تھا کہ جس خاتون سے اس نے بات کی تھی وہ اسفند کی شریک حیات ہے۔ اسفند کو تصحیح کرنا کچھ عجیب سا لگا اس لیے خاموشی سے وہ اس کی بات سنتا رہا۔

"مجھے آپ کو تھینکس بولنا تھا۔ اس روز میری گاڑی ورکشاپ میں تھی اس لیے بہت مسئلہ ہو گیا تھا۔ آپ نے اس کی ٹیچر سے بھی بات کی' اس کے لیے بھی بہت شکریہ۔"

"ارے داؤد صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کوئی خاص کام تو نہیں کیا میں نے' شیری مجھے اچھا لگا تھا اس لیے میں اس کی ٹیچر سے مل لیا۔ شکریہ والی تو کوئی بات ہی نہیں۔"

وہ داؤد کو اس تشکرانہ احساس سے بچانے کی خاطر عجلت سے بولا۔

"پھر بھی تمہارا شکریہ یار! میرے لیے تو یہ سچ مچ مسئلہ بنا ہوا تھا۔"

داؤد نے تکلف کا چولا اتار پھینکا تھا۔ اسفند کو بھی کافی حوصلہ ہوا۔ چند لمحوں بعد فلائنگ کارپٹ پر بیٹھ کر' ماوئی اور شیری کو گود میں بٹھائے وہ بالکل بچوں کی طرح انجوائے کر رہے تھے۔ گھر واپسی تک داؤد' اسفند کے لیے داؤد بھائی اور اسفند شیری کے لیے "لالہ" بن چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

"یہ لیجیے۔" زینب کی آواز پر انہوں نے فائل سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ کافی کا ایک ہی مگ ہاتھ میں لیے کچھ خفا خفا کچھ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ انہوں نے کچھ سوچا۔ فائلز بہت ضروری تھیں اور بیوی بے حد ضروری تھی۔ انہوں نے کچھ سوچا پھر فائلز بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھیں اور مسکراتے ہوئے مگ تھام لیا۔

"تم کافی نہیں لو گی۔" وہ دونوں ہی رات کے کھانے کے بعد کافی پیا کرتے تھے ٹرے میں ایک مگ دیکھ کر انہوں نے استفسار کیا۔

"نہیں۔" بے تاثر آواز میں کہتی وہ الماری کی طرف چلی گئی۔ ابھی کپڑے پریس کرنا باقی تھے۔

"تمہیں لینی چاہیے... تھکن اتر جاتی ہے۔" وہ اس کی پشت پر بکھری بکھری چٹیا دیکھ کر بولے۔

"مجھے تھکن نہیں ہے۔ آپ میری فکر مت کیجیے۔" الماری میں سے آواز آئی تھی۔

"میں فکر نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟" وہ

مسکرا کر بولے' انہیں اس کی خفگی کا احساس ہو گیا تھا۔ ان کی بات پر الماری میں سے کوئی صدا نہیں ابھری تھی۔

"زینب۔" انہوں نے بہت محبت سے پکارا۔ الماری سے کپڑے نکال کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"جی۔" وہیں کھڑے اس نے پوچھا۔

"یہاں آؤ۔" ان کی آواز میں محبت کی شیرینی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"کیوں؟" اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ خضر کو ایک بار پھر ہنسی آگئی۔

"آؤ تو سہی یار!" محبت جمع مصالحت' ان کی آواز میں دونوں چیزیں تھیں۔

"وہاں آکر میں جولیا آرمنڈ تو نہیں بن جاؤں گی' زینب ہی رہوں گی' زینب... جس کے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔"

وہ دور کھڑی کہہ رہی تھی۔ خضر کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ بکھرنے لگی جسے دیکھ کر زینب کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ ہاتھوں میں پکڑے لباس کو بستر پر پھینک کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"آپ ہنس رہے ہیں۔ میں ناراض ہوں خضر۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ خضر پھر مسکرائے اسفند کے سامنے بڑی اماں بن کر رہنے والی زینب ان کے سامنے کتنی چھوٹی سی گڑیا سی ہو جایا کرتی تھی۔

"ایسے ناراض ناراض' کتنی پیاری' کتنی اپنی اپنی لگتی ہو۔" وہ اس کے ماتھے پر آئی لٹ کو چھو کر بولے۔

"اچھی لاجک ہے یعنی پیارا لگنے کے لیے ضروری ہے کہ میں آپ سے ناراض رہوں۔"

اس نے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں' بالکل نہیں' ناراضگی بالکل ختم' ہم آپ کی ناراضگی کی وجوہات جان کر ان کا سدباب کریں گے ملکہ عالیہ! لیکن... پہلے آپ یہ مگ پکڑیے اور ہمارے ساتھ کافی شیئر کیجیے۔"

انہوں نے مگ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیا اور پھر اس کی گود میں سر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولے۔

"سوری یار! میں تمہیں بالکل بھی ٹائم نہیں دے پاتا نا' مجھے احساس ہے لیکن میں کیا کروں' آج کل کام کا لوڈ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ اسفند کو بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں چاہتا ہوں پہلے وہ اسٹڈیز مکمل کرلے پھر ہی اسے بزنس کی طرف لاؤں۔"

زینب خاموشی سے ان کو سن رہی تھی۔ یہ وہ باتیں تھیں جو وہ اکثر اس سے کرتے رہتے تھے۔

"میں اس پر ذمہ داری نہیں ڈالنا چاہتا' ویسے بھی اس کے اپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ کی ڈیٹس آگئی ہیں۔ اس کا ایڈمیشن ہو گیا تو وہ آسٹریلیا چلا جائے گا پھر تو مجھے ہی سنبھالنا ہے نا سب' بزنس' گھر' ماوئی... اور تم۔" وہ مسکرائے۔ زینب ہنس بنی بیٹھی تھی۔

"ارے... ناراض ہو ابھی تک؟" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"آپ ناراض رہنے کب دیتے ہیں۔" اس کی بات پر وہ دونوں ہی مسکرائے تھے۔

"کل کہیں باہر چلیں زینب! ڈنر کریں گے اور لانگ ڈرائیو پر بھی چلیں گے۔"

انہوں نے اس کا عندیہ لینا چاہا' اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بس اسفند کی ٹائمنگز کا نہیں پتا تھا۔

"کل نہیں... پرسوں چلتے ہیں۔ کل تو اسفند کہیں اور بزی ہے۔"

"پاگل۔" خضر نے اپنے سینے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر کہا۔

"نو اسفند' نو ماوئی... صرف تم اور میں۔"

ان کی بات پر زینب کھلکھلا دی تھی۔ اسے لگا تھا اس کی ساری خفگی دور ہو گئی تھی اور خضر اس کی ہنسی دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ اگر ایسی ریا سے پاک ہنسی دیکھنے کے لیے کام کا تھوڑا حرج ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

✡ ✡ ✡

"داؤد بھائی کا تعلق بنیادی طور پر کراچی سے ہے۔

CamScanner

ان کی باقی فیملی تو کراچی میں ہی ہے۔" وہ کچن میں ہی بڑے ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا اسے بتا رہا تھا۔ زینب اس کے لیے چپاتی بنا رہی تھی۔ بوقت ضرورت اور عجلت میں کھانا کچن میں ہی کھالیا جاتا تھا۔ اسفند دوپہر کے کھانے پر موجود نہیں تھا اس لیے زینب شام کی چائے کے ساتھ اس کے لیے تازہ روٹی ڈال رہی تھی۔

"دراصل داؤد بھائی ایف ایف سی میں ملازم تھے' پہلے صادق آباد میں پوسٹنگ تھی' ابھی کچھ مہینے پہلے ہی لاہور ٹرانسفر ہوا ہے۔"

اس نے جگ سے گلاس میں پانی نکالتے ہوئے تفصیل بتائی۔ زینب مسکراتے ہوئے سب سن رہی تھی۔ اس کے باتوں میں داؤد رضا نامی اس شخص کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔

"تمہاری ان سے کافی دوستی ہو گئی ہے؟" روٹی توے سے اتارتے ہوئے زینب نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

"دراصل داؤد بھائی سے تو تقریباً" روز ہی ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا' جب میں ماوئی کو لے کر پارک تک جاتا ہوں تو شہریار کو بھی پک کر لیتا ہوں اس طرح دونوں بچے آپس میں خوب انجوائے کر لیتے ہیں۔"

"شہریار کی اور ماوئی کی تو بہت دوستی ہو گئی ہے۔ ہر وقت شیلی' شیلی (شیری' شیری) کرتی رہتی ہے۔" وہ بہن کے متعلق بتاتے ہوئے محبت سے بولا۔

"ان کی وائف کا انتقال ہو چکا ہے نا؟" زینب اس کے آگے کھانا رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"جی ۔۔۔ تقریباً" تین سال پہلے' ڈلیوری کے وقت۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔ اسے یہ بات بتاتے ہوئے کچھ شرم سی آگئی تھی۔

"پھر یہ لوگ اپنی لائف کو مینج کیسے کرتے ہیں' کیا کوئی کل وقتی ملازمہ وغیرہ ہے؟" زینب نے بھی فنافٹ بات پلٹی۔ وہ اب اس کے آگے' بھنا قیمہ' سلاد اور رائتہ وغیرہ رکھ رہی تھی۔

"پہلے ایک لڑکا رکھا ہوا تھا' اس کی شادی ہو گئی۔ اب وہی لڑکا اور اس کی بیوی ان کے یہاں کام کرتے ہیں۔ اب تو ان لوگوں کی روٹین کافی سیٹ ہو گئی ہے ورنہ پہلے بہت پرابلم تھے۔"

وہ رغبت سے کھاتے ہوئے بتانے لگا۔ بھنا قیمہ اس کا فیورٹ کھانا تھا۔

"چائے بناؤں تمہارے لیے؟" وہ ساس پین چولہے پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آدھا کپ ۔۔۔ داؤد بھائی کو بھی بھنا ہوا قیمہ بہت پسند ہے۔ ایک دن بتا رہے تھے کہ تمہاری بھابھی یہ ڈش سب سے اچھی بنایا کرتی تھی۔"

اسفند کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔ یکایک اسے ایک خیال آیا۔ داؤد کی ملازمہ اچھی کک نہیں تھی۔

"زینب! میں یہ داؤد بھائی کے لیے لے جاؤں۔"

"ارے ۔۔۔ یہ بچا کھچا۔" وہ حیران ہوئی' اسفند کو تو ایٹی کیٹس کا اتنا خیال رہتا تھا۔

"داؤد بھائی کو پسند آئے گا۔ ان فیکٹ ان کی ملازمہ بہت برے کھانے بناتی ہے۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ آپ تو زبردست کک ہیں۔"

وہ ایک بار اسے تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

"تم یوں کیوں نہیں کرتے' انہیں کسی دن رات کے کھانے پر انوائٹ کر لو۔ تمہارے ڈیڈ مل لیں گے تو ان کی تسلی بھی ہو جائے گی۔ کل کہہ رہے تھے اسفند نے پتا نہیں یہ نئی نئی دوستیاں کہاں سے پال لی ہیں۔" زینب نے اسے اصل بات بتائی۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میں داؤد بھائی سے کہوں گا۔ ڈیڈ کو ان سے ملنا اچھا لگے گا ہی از ریئلی اے نائس مین۔"

وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوا۔

"تمہارا اینٹری ٹیسٹ کب تک ہو رہا ہے؟" زینب چائے کو دم دے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"بس کچھ ہی دن رہ گئے ہیں۔ ٹیسٹ تو اسلام آباد میں ہو گا پھر میں آسٹریلیا چلا جاؤں گا۔"

وہ پرجوش انداز میں بولا۔ اسے سڈنی یونیورسٹی میں پڑھنے کا جنون کی حد تک کا شوق تھا کیونکہ اس کی والدہ نے وہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ خضر بھی بیٹے کی خوشی میں خوش تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ ماوئی کی ممی ہیں؟" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کسی قدر تحیر لیے اسفند سے پوچھ رہا تھا۔

"جی یہ ماوئی کی ممی ہیں۔" اسفند اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا' اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولا۔ وہ اسے خاص طور سے زینب سے ملوانے کے لیے لایا تھا لیکن شہریار تب سے اب تک خاموش بیٹھا تھا حالانکہ زینب بہت پیار سے اس سے ملی تھی وہ خود بھی ماوئی کا گھر دیکھنے کے لیے بہت پرجوش تھا لیکن یہاں آکر اس کا سارا جوش ختم ہو گیا تھا اسے شاید کوئی بات بری لگی تھی۔

"میں شہریار کے لیے نوڈلز بناتی ہوں۔" زینب کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

"یہ مزے کی بات ہے زینب ممی ہمارے لیے نوڈلز بنائیں گی۔"

اسفند نے اسے لالچ دیا لیکن وہ پھر بھی خاموش بیٹھا تھا۔ اسفند کو اس کی خاموشی کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ اسے مسلسل خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شہریار چپ چاپ فرش کو گھورنے میں معروف تھا۔

"اچھا چلو! ہم کمپیوٹر گیم کھیلتے ہیں۔" وہ اسے لے کر اپنے بیڈ روم کی سمت آگیا تھا۔ لیکن یہاں بھی شہریار نے کوئی گرمجوشی ظاہر نہیں کی۔

"شیری یار! کیا ہو گیا ہے؟ موڈ کیوں آف ہے؟" اس نے آخر بہت محبت سے پوچھ ہی لیا۔ کچھ دیر تک وہ اس کا چہرہ تکتا رہا پھر اس کی گود میں بیٹھ کر بولا۔

"لالہ! ماوئی کی ممی تو ہیں' سحر کی بھی ممی ہیں' گینڈے کی بھی ۔۔۔ لیکن میری ممی کیوں نہیں ہیں؟ وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئیں کیوں؟ میں ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟"

اسفند کو یقین نہیں آیا کہ یہ الفاظ شہریار کے منہ سے ادا ہوئے ہیں۔ اتنے دنوں کے میل ملاقات میں اس نے ایک بار بھی ماں کی محرومی کے متعلق ذکر نہیں کیا تھا۔ پاپا کی شکایتیں ہر وقت کرتا تھا اور جب کبھی اسفند مذاق میں اس کے پاپا کے متعلق کوئی غلط بات کرتا تو شہریار منہ پھلا کر' اس سے ناراض ہو کر الگ بیٹھ جاتا۔

"میرے پاپا بہت اچھے ہیں' بہت اچھے سب سے اچھے۔"

"شیری! جان آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ کی ممی آپ کے پاس رہا کرتیں' آپ ان کو مس کرتے ہو۔" وہ بہت پیار سے اس کے ماتھے سے بال ہٹا کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں انہیں مس تو نہیں کرتا۔" اس کی نظریں اب بھی لاتعلق اور شکوہ کناں تھیں۔ اسفند کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"میرا دل بھی کرتا ہے نوڈلز کھانے کو' رانی کو تو نوڈلز بنانے ہی نہیں آتے۔ ماوئی کی ممی تو فوراً" بنا دیتی ہوں گی۔ وہ جب بھی کہتی ہو گی ۔۔۔ جب بھی اس کا دل چاہتا ہو گا۔ ہے نا ۔۔۔ ہے نا لالہ!"

اسفند خاموشی سے اسے سن رہا تھا' اس کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اسے سمجھا سکتا۔

"اللہ میاں کو ایسے تو نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو سب لوگوں کو ممی دینی چاہئیں۔ یہ تو نہیں کہ ماوئی کو دے دیں اور شیری کو دیں ہی نا۔ یہ تو غلط بات ہے ۔۔۔ یہ تو بہت ہی غلط بات ہے۔ آپ کو پتا ہے لالہ!"

اس نے اب اسفند کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

"پاپا کہتے ہیں اللہ میاں بہت بڑے ہیں۔ وہ سب کچھ ٹھیک کرتے ہیں۔ وہ کبھی غلط کام نہیں کرتے اور ۔۔۔ اور جو بھی بچہ غلط کام کرتا ہے ۔۔۔ اس سے تو اللہ میاں بہت ہی ناراض ہوتے ہیں۔ اس کو پنش کرتے

CamScanner

ہیں تاکہ وہ بچہ دوبارہ کبھی غلط کام نہ کرے۔" وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

"میں نے تو کبھی غلط کام نہیں کیا۔ کبھی اپنے ڈوگی کی دم کو نہیں کھینچا۔ کبھی کسی سے فائٹ نہیں کی۔ کبھی گیم میں چیٹنگ نہیں کی۔ پھر۔۔۔ پھر لالہ کیوں اللہ میاں نے میری ممی کو کیوں اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے کیوں پنیش کیا؟"

شہریار کی باتیں بہت جذباتی تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے دل میں شاید بہت دن کا غبار جمع تھا۔ اسفند تڑپ اٹھا۔

"نہیں شیری! ایسے نہیں سوچتے۔ ایسے بالکل نہیں سوچتے۔ ماوئی کی ممی ہیں اور آپ کی نہیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب مختلف ہیں۔ ہم سب ایک سے تو نہیں ہیں۔ ہم میں اور۔۔۔"

"نہیں لالہ! ہم سب ایک ہیں۔" وہ اسفند کی بات کاٹ کر بولا۔

"ٹیچر کہتی ہیں۔ اللہ میاں نے ہم سب کو ایک سا بنایا ہے۔ ہم سب ایک ہیں لالہ! ہم سب ایک سے ہیں۔"

اسفند خاموش ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ آگیا تھا کہ سمجھانے کی ضرورت شہریار کو نہیں بلکہ داؤد رضا کو ہے۔ کوئی چیز چھن گئی، ٹوٹ گئی یا کھو گئی، قصور آپ کا نہیں، قدرت کا ہے۔ قدرت کو الزام مت دیجئے کیونکہ قدرت ہر چیز کا متبادل فراہم کرتی ہے۔ شہریار بچہ تھا اسے وقتی طور پر بہلایا جا سکتا تھا۔۔۔ وقتی طور پر زینب کو نوڈلز کے ساتھ کمرے میں آتا دیکھ کر وہ اسفند کی گود سے اتر کر اس کے پاس آگیا تھا اور تھوڑی دیر گزرنے کے بعد وہ بھی ماوئی کی دیکھا دیکھی زینب کو ممی کہہ کر بلا رہا تھا۔

"تم پہلے شخص نہیں ہو جو مجھے یہ مشورہ دے رہا ہے۔ مریم کے انتقال کے بعد سے سب ہی لوگ یہی مشورہ دیتے ہیں۔"

داؤد نے اپنے سامنے بیٹھے اس نوجوان لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا وہ اس کا بھائی نہیں تھا لیکن چند دنوں کی رفاقت میں ہی وہ اسے بھائی سے بڑھ کر عزیز ہو گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں میں پہلا شخص نہیں ہوں جو آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں آخری شخص ہوں جو آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہے کیونکہ آج کے بعد سے کسی اور کو یہ مشورہ دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی آپ شادی جو کر لیں گے۔"

اسفند نے پر استحقاق لہجے میں کہا۔ وہ آج خاص طور سے گھر سے تیاری کر کے اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ دونوں داؤد کے چھوٹے سے لیونگ روم میں بیٹھے تھے اسفند کی بات سن کر وہ ہنس دیا۔

"میں نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں۔"

"کچھ کام بغیر سوچے سمجھے خود بخود ہو جایا کرتے ہیں۔"

"پہلی شادی میں نے سوچے سمجھے بغیر ہی کی تھی۔"

"اوہ رئیلی۔۔۔ پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ دوسری بار بھی سوچے سمجھے بغیر کر لیجئے۔"

"اسفند! مجھے دوبارہ محبت ہی نہیں ہوئی۔ مریم کے ساتھ ہی سمجھو سب ختم ہو گیا۔"

اب کی بار وہ قدرے زچ ہو کر بولا تھا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ دوبارہ محبت کی شادی کیجئے۔ شادی آپ کی ضرورت ہے۔ آپ شادی کیجئے محبت خود بخود ہو جائے گی۔ محبت تو ہو ہی جایا کرتی ہے داؤد بھائی اس کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔"

وہ زینب کی مثال دیتا دیتا رک گیا تھا کیونکہ وہ کیس مختلف تھا۔ نہ محبت نہ ضرورت۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ضرورت ایجاد کی نہیں محبت کی ماں ہے۔"

داؤد نے اس کی بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

"یہ کمبخت ضرورت ہر چیز کی ماں ہے۔ ضرورت ہے کے تحت کائنات کی ہر چیز رونما ہوتی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ ریلکس۔ جب مجھے شادی کی ضرورت محسوس ہوگی میں شادی کر لوں گا۔" وہ جیسے مطمئن کر رہا تھا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن آج سے پچاس سال بعد سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔"

چڑ کر بولا۔ داؤد ہنس دیا تھا۔

"اب میرے منہ پر تو ایسے نہ کہو۔ میرا تو خیال تھا میں آج سے پچاس سال بعد بھی کافی ہینڈسم ہوں گا۔"

"مجھے امید ہے ڈیڈ بھی ایسے ہی کہا کرتے ہوں گے لوگ ان سے شادی کے لیے کہتے ہوں گے ایسے ہی ہر بات مذاق میں ٹال دیا کرتے ہوں گے۔

ڈیڈ کی لائف

سب سے زیادہ بورنگ تھی اور اب ڈیڈ پہلے کی نسبت ایک مختلف آدمی ہیں۔ ایک خاتون آپ کی لائف میں بہت تبدیلی لا سکتی ہے۔ آئی ایم شیور آپ بہت خوش ہوں گے۔"

اب کی بار اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔ اس نے داؤد کو اپنے گھریلو حالات کے متعلق کافی کچھ بتا رکھا تھا۔

"میں ابھی بھی بہت خوش ہوں میرے بھائی!" داؤد ابھی بھی ہٹ دھرمی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں آپ خوش ہیں کیونکہ آپ نے حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے لیکن۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"شہریار خوش نہیں ہے۔ اسے ماں کی ضرورت ہے۔ ہر بچے کو ماں کی ضرورت ہے چاہے اس کا باپ اسے دنیا بھر کی دولت، دنیا بھر کی نعمتیں، دنیا بھر کی خوشیاں فراہم کر رہا ہو۔ اسے ضرورت ہوتی ہے داؤد بھائی! اسے ضرورت رہتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ماں کی کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ آپ میری مثال لے لیجئے میں کتنا بڑا ہو چکا ہوں لیکن۔۔۔" وہ خاموش ہوا پھر نادم ہنسا۔ ایک تکلیف دہ ہنسی۔

"میں نے کبھی ڈیڈ سے بھی یہ سب شیئر نہیں کیا، صرف آپ کو بتا رہا ہوں کہ مجھے آج بھی، اس عمر میں بھی ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ زینب کو ہمارے گھر میں آئے صرف چار سال ہوئے ہیں اور ویسے بھی ان کی میری عمر میں فرق ہی اتنا تھوڑا ہے کہ میں انہیں "ماں" کہہ تو سکتا ہوں، ماں سمجھ نہیں سکتا، ان کی ماں کی طرح عزت تو کر سکتا ہوں، ان سے ماں کی طرح محبت نہیں کر سکتا" اس کی آواز میں نمی نہیں تھی۔ لیکن اس کے الفاظ نم تھے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں، آپ نہیں سمجھ سکتے آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں نے وہ درد سہا ہے جو شہریار سہہ رہا ہے۔ میں اس تکلیف سے گزرا ہوں جس سے شہریار گزر رہا ہے۔ آپ کی شخصیت میں کمی رہ جاتی ہے، بہت کمی رہ جاتی ہے۔ شہریار آج دوسرے بچوں کو اپنی ماؤں کے ساتھ دیکھ کر جس قسم کے جذبات کا شکار ہوتا ہے، کل یہی جذبات کسی اور شکل میں اس کی شخصیت، اس کے کردار کو گھنانے کا باعث بن سکتے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"یار اسفند! تم نے تو مجھے جذباتی کر دیا ہے میں اپنے ننھے سے شہریار کو اپنے ذہن میں کچھ ایسا دیکھ رہا ہوں جیسے۔۔۔ جیسے بوٹا سنگھ یا۔۔۔ یا پھر پھولن دیوی یا۔۔۔"

"پلیز داؤد بھائی! میں بہت سیریس ہوں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں جانتا ہوں تم بہت سیریس ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تم سیریس رہو مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں نے مزید تمہاری ایسی سڑی ہوئی باتیں سن لیں تو ابھی میں سہرا باندھ کر قاضی صاحب کے سامنے جا بیٹھوں گا۔"

وہ جان بوجھ کر اس انداز میں بات کر رہا تھا تاکہ اسے اس کی مخصوص کیفیت سے باہر نکال سکے۔

"تم تو ماشاء اللہ مجھے بالکل ایک مکمل شخصیت کے ڈھانچے میں ڈھلے نظر آتے ہو تمہارے کردار و شخصیت میں تو کوئی کمی نظر نہیں آتی مجھے۔"

اس کی بات پر اسفند کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکان پھیل گئی۔

”آپ نے کبھی مجھے میرے دوسرے فرینڈز کے ساتھ نہیں دیکھا ناں‘ جلن و حسد سے مر مر جاتا ہوں جب جب وہ اپنی اپنی والداؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ زینب بہت اچھی ہیں میرا خیال رکھتی ہیں بالکل ایسے جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کا رکھ سکتی ہے لیکن ــــ“ وہ خاموش ہوا تھا پھر سر جھٹک کر بولا۔

”خیر میرا ذکر چھوڑیے اپنی بات کیجئے۔“

”میں تو کہتا ہوں سارے قصے پر ہی مٹی ڈالو۔“ داؤد کافی سے زیادہ ڈھیٹ تھا۔

”اوکے ــــ ایز یو وش۔“ اسفند یکدم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”چلتا ہوں۔“

”ارے سنو تو‘ ناراض ہو گئے ہو۔“ وہ بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں داؤد بھائی‘ آپ کا اپنا مسئلہ ہے‘ میں تو صرف آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ کی مرضی نہیں تو میں یا کوئی بھی اور شخص آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔“ وہ اب بالکل نارمل انداز میں بات کر رہا تھا۔ داؤد کو پہلی بار اندر ہی اندر تھوڑی سی عجیب کیفیت کا شکار ہونا پڑا۔ وہ اسے مین گیٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔

”اسفند! اس بات کی کیا گارنٹی ہو گی کہ وہ عورت میرے بچے کو ماں کی طرح ہی پیار دے گی۔ وہ اسے سوتیلے پن کا شکار نہیں ہونے دے گی۔“

وہ گیٹ سے نکل کر اپنے گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے داؤد کی آواز سنی۔

”محبت کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ محبت گارنٹی سے مبرا قسم کی چیز ہے۔ ہم کسی سے اسٹیمپ پیپر پر تو نہیں لکھوا سکتے کہ آیا وہ ہمارے بچے کو ماں کا پیار دے گی یا سوتیلی ماں کا۔ اس کسان کی فصل ہمیشہ اچھی ہوتی ہے جو پُر امید ہو کر بیج بوتا ہے۔ اچھا سوچیں گے تو ہی اچھا ملے گا نا۔“ وہ نصیحت آمیز انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اچھا نہیں اچھی‘ مجھے اچھی چاہیے۔“ داؤد نے مسکرا کر کہا تو اسفند بھی ہنس دیا۔

”اوکے ہم بھی سوچیں گے تو اچھی ہی ناں۔“

”اور میرے باپ یہ بھی بتا دو کہ یہ اچھی کہاں سے ملے گی؟“ داؤد نے کہا‘ اسفند فرنٹ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

”آپ اس بارے میں پریشان مت ہوں۔ زینب ہیں ناں‘ ہمیں اچھی ڈھونڈ کر دیں گی انشاءاللہ۔“ وہ گاڑی بھگانے سے پہلے یہ کہنا نہیں بھولا تھا۔

☼ ☼ ☼

”شیری! ایک بات پوچھوں؟“ وہ اسے اپنے پہلو میں لٹائے‘ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اسے سلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے شاید ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

”پاپا! مجھے پتا ہے آپ کہو گے فائیو کا ٹیبل سناؤ۔ میں سو گیا ہوں پاپا!“

وہ فوراً کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر چکا تھا۔ داؤد کو ہنسی آ گئی۔

”نہیں شیطان! ٹیبل نہیں سننا مجھے‘ ادھر دیکھو میری طرف۔“ وہ اسے گدگدا کر اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

”سنو تمہیں ــــ ممی کیسی لگتی ہیں؟“ اسفند کی باتوں نے اسے کچھ محتاط کر دیا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا کیا محسوس کرتا ہے‘ کیا سوچتا ہے۔

”مم ــــ ای“ وہ ایک دم ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”بہت اچھی‘ بہت ہی اچھی‘ بالکل سنڈریلا جیسی اور آپ کو پتا ہے وہ مجھ کو بہت پیار کرتی ہیں۔ نوڈلز بھی بناتی ہیں اور ــــ میرے نیلز کتنے گندے ہو رہے تھے‘ کل انہوں نے سب کاٹ دیے۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا کر بولا ایک لمحے کو تو داؤد سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

”پاپا!“ وہ اب اس کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس موضوع کے لیے اس کی گرمجوشی ظاہر کر رہا تھا۔

”پاپا! ویسی ممی ہم نہیں لا سکتے۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

وہ اس کے سینے پر سر رکھے کہہ رہا تھا۔

”اسفند لالا کہتے ہیں جن کی ممی ہوتی ہیں وہ کبھی گندے یونیفارم میں اسکول نہیں جاتے وہ اسکول سے کبھی بھی نہیں ہوتے اور ــــ پھر کتنا مزا آتا ہو گا نا جب سنڈے پر دونوں اسکول آتے ہوں گے‘ مجھے بھی پاپا بھی ہے نا ــــ ہے نا پاپا۔“

اس کی آواز پر نیند غالب آ رہی تھی۔ داؤد خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

”مجھے بھی جلا ہوا نہیں بناتیں ممی! پھر گینڈا میرا مذاق بھی نہیں اڑائے گا۔ میری برتھ ڈے پر کیک بھی ممی گھر میں بنا لیا کریں گی جیسے مادی کی برتھ ڈے پر زینب ممی بنا لیتی ہیں۔“ وہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں بیان کر رہا تھا۔

”شیری! یہ سب تم سے اسفند نے کہا ہے؟“ داؤد نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

”نو پاپا! اسفند لالہ کہتے ہیں کوئی بات نہیں جو ہماری ممی نہیں ہیں۔ زینب ممی بھی تو تمہاری ممی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ میں ان کو تھوڑے دن کے لیے اپنے گھر لے جاؤں؟“ وہ منہ لٹکا کر کہہ رہا تھا۔

داؤد بیٹے کی اس انوکھی فرمائش پر مسکرا دیا۔

”پھر؟“

”پھر کیا؟ انہوں نے کہا یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔ ایک ہی بات ہے۔“

اس کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

”ویسے پاپا! ہم ان کو تھوڑے دن کے لیے ــــ اپنے گھر لائیں گے ضرور بس ایک دن کے لیے ــــ ٹھیک ہے نا پاپا۔“ داؤد خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

”اُف‘ یہ پاکستان کا ٹریفک ــــ خدا ہی محفوظ رکھے۔“ اکبر نے اس کے کیبن میں قدم رکھتے ہوئے شاید اپنے پیچھے آنے والے کسی شخص سے کہا۔ داؤد کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر متحرک تھیں اس نے اکبر کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کا تو یہ تکیہ کلام تھا ہر وقت پاکستان کی مختلف چیزوں کے متعلق اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے خدا سے حفاظت کی دعا کرنا۔ داؤد جانتا تھا دونوں چیزیں ڈھیٹ ہیں‘ پاکستان کے مسائل جو سدھرنے کا نام نہیں لیتے اور اکبر جو خود کبھی ہولتا ہے اور دوسروں کو بھی ہولاتا ہے۔ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ رہا۔ اس کا کلائنٹ آنے والا تھا۔

”داؤد! یہ پاکستان کا ٹریفک ــــ توبہ توبہ۔“ اب اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگایا۔ داؤد تھوڑا سا مسکرایا پھر اسے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

”یہ تو کتے کی دم ہے بھائی! تم زیادہ پریشان مت ہو۔“

”اتنا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے‘ ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں‘ یہ حفیظ سنٹر کے پاس کوئی ایک آدھ تو موقع پر ہی انا اللہ ہو گیا تھا‘ اور پھر لوگوں کا ہجوم‘ یہ نہیں کہ کوئی آگے بڑھ کر مدد کر دے سب تماشا دیکھ رہے ہیں۔“

وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اس لیے کافی سے زیادہ پریشان اور افسردہ ہو رہا تھا۔ داؤد کو بھی دکھ ہوا۔

”یہ سب ہوا کیسے؟“ اپنا کام چھوڑ کر وہ تفصیل سننے لگا۔

”تمہیں پتا تو ہے موسم کیسا ہو رہا ہے؟ ہر طرف دھند کی چادر چھائی ہوئی ہے وین والے زمانے بھر کے بدلحاظ واقع ہوئے ہیں۔ دو ڈرائیورز کی ریس لگی تھی تیز رفتاری میں ایک کار کو ٹکر مار دی۔ ایک ہی آدمی تھا گاڑی میں‘ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ آئی ایم شیور ہی از ایکسپائرڈ۔ وین کے مسافر میں سے بھی کچھ لوگ زخمی ہوئے۔ کافی زخمی تھے۔ مرے نہیں تو مر جائیں گے۔“

”خدا کا نام لو اکبر! کیسی باتیں کر رہے ہو۔ خدا سچ مچ محفوظ رکھے ہمیں بھی اور باقی سب کو بھی۔“

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ اگرچہ ایسے حادثات

کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں تھے لیکن صبح ہی صبح ایسی باتوں کو سن کر تمام دن طبیعت مکدر سی رہتی ہے۔ داؤد سے بھی کوئی کام ہو نہ پایا۔ اکبر نے تمام کولیگز کو تفصیل سے بتایا تھا' آفس میں بھی یہی موضوع زیر بحث رہا حفیظ سنٹر ان کے آفس کے بالمقابل ہی تو تھا۔

گھر واپس جاتے ہوئے داؤد نے وہاں ٹریفک اور لوگوں کا ہجوم بکھراں دیکھتے ہوئے صبح ہونے والے حادثات کے نشانات کھوجنے چاہے تھے مگر زندگی کی تیز رفتاری ٹریفک کی تیز رفتاری سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے لوگوں کے چہرے اور تارکول کی سڑک کی سطح ایک سی نظر آئی۔ کرخت اور بے حس لاتعلق اور گمشدہ۔

✡ ✡ ✡

"بابا! اسفند لالہ! ابھی تک نہیں آئے۔" میز کی چکنی سطح پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکائے اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرے کو سجائے وہ بہت دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ شاید کسی ضروری کام میں پھنس گیا تھا اس لیے ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"آتا ہی ہو گا' تھوڑا صبر سے کام لو بیٹا!"

وہ میل گبسن کی "بہبر یو ہارٹ" میں مکمل طور پر کھویا ہوا تھا۔

"انہوں نے وعدہ کیا تھا' مجھ سے اور ماوی سے بھی آج پارک جائیں گے۔"

وہ شکایت آمیز انداز میں بولا تھا۔

"کتنی دیر ہو گئی بابا!" باپ کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہ اس کے قریب چلا آیا پھر اس کے کندھے کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"او کے بابا! لاؤ کارڈلیس' ابھی پوچھ لیتا ہوں۔"

اسے بیٹے پر ترس آ ہی گیا تھا۔

ٹی وی پر ہی نظریں مرکوز کیے ہوئے اس نے نمبر ملایا تھا لیکن مسلسل گھنٹی کے باوجود کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کی نظریں ٹی وی پر اٹکی تھیں اس لیے ذرا کی ذرا کوفت ہوئی اس نے پھر کوشش کی تھی مگر ابھی بھی سابقہ صورت حال تھی۔

"شیری! بیٹا! وہ گھر سے نکل چکا ہے بس آتا ہی ہو گا۔" شہریار جو اسے ہی دیکھ رہا تھا اس جواب پر کافی بدمزہ ہوا۔ وہ جوتوں سمیت باپ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

فلم اور اداکار دونوں ہی داؤد کے پسندیدہ تھے اس لیے اس کی ساری توجہ ٹی وی پر تھی۔ اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ شہریار اس کی گود میں ہی سر رکھے سو چکا ہے۔

فلم ختم ہوئی تو اس نے دیکھا تھا۔ شہریار کو اس کے جوتے وغیرہ اتار کر بستر پر سلانے میں اسے مزید ٹائم لگ گیا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو تقریباً "مغرب کی اذان کو بھی پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ اس نے دوبارہ اسفند کے گھر فون ملایا تھا مگر جواب ابھی بھی ندارد۔ اسے حیرت ہونے لگی تھی۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ شہریار سے وعدہ کرنے کے باوجود اسفند اسے لینے کے لیے نہ آیا ہو۔ پارک نہیں جانا ہوتا تھا تو وہ اسے گھر لے جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اتنا ذمہ دار تھا کہ اگر کسی وجہ سے نہ آ سکتا تو فون کر کے بتا ضرور دیا کرتا تھا۔

آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ کوشش کی تھی اور پھر ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ فون ملا کر چیک کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ اب وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو رہا تھا۔ گھر میں سب ہی لوگوں کی غیر موجودگی کسی بڑے مسئلے کو ظاہر کر رہی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں کھو گیا تھا رات کے کسی پہر فون کی مسلسل بجتی گھنٹی سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"ہیلو! کون صاحب بات کر رہے ہیں؟"

اس نے مدہوش لہجے میں پوچھا لیکن دوسری طرف سے جو بات اس نے سنی تھی اس نے اس کی نیند کو ایک دم اڑا دیا تھا۔

"داؤد بھائی! میرے ڈیڈ... میرے ڈیڈ نہیں رہے داؤد بھائی۔"

"یہ تو اچھا نہیں کیا ڈیڈ نے' یہ تو غلط بات ہے... یہ تو... بے وفائی ہے۔ مجھے اب... ان کی۔ ب

ہے زیادہ ضرورت تھی تو... وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں جانا تھا تب ہی چلے جاتے جب ماں چلی گئی تھی۔ میں بھی... زندہ رہ لیتا ماں باپ کے بغیر' لیکن یہ تو بے وفائی ہے... یہ تو بے ایمانی ہے یہ بہت بڑی بے ایمانی ہے داؤد بھائی!"

وہ اس کے سامنے بیٹھا اٹک اٹک کر بول رہا تھا بلکہ آنسو بہت روانی سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ خضر صاحب کے انتقال کو دس روز گزر چکے تھے۔ اس دوران داؤد نے ایک مرتبہ بھی اسفند کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد افسردہ تھا غم اس کی آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی ننھی سی بہن کو بالکل ایسے سینے سے لگائے رکھتا تھا جیسے کوئی پرندہ اپنے نومولود کو پروں میں دبکائے رہتا ہے۔ وہ اپنی بہن سے بالکل ایسے پیش آ رہا تھا جیسے کوئی یتیم بیٹا اپنی بیوہ ماں سے پیش آ سکتا ہے۔ داؤد نے اس کو ایسے دیوانوں کی طرح روتے نہیں دیکھا تھا جیسے اب وہ اس کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔ داؤد ہر روز وقت نکال کر شام کو اس کے پاس ضرور جاتا تھا تاکہ اس کا غم بانٹ سکے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حفیظ سنٹر کے پاس اس روز ہونے والے خوفناک ایکسیڈنٹ میں اسفند کے والد فوت ہوئے ہیں۔ یہ بات اسے وہاں جا کر پتا چلی تھی۔ اسے خضر صاحب سے ملنے کا کافی شوق تھا لیکن اس قسم کی ملاقات کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مسلسل دس روز سے وہ ان کے ساتھ گھر کے فرد کی طرح رہ رہا تھا۔

اس نے صرف ایک مرتبہ جنازہ کے وقت زینب کو دیکھا تھا اور اسے اس لڑکی کی قسمت پر دکھ ہوا تھا۔ اسے اسفند کے صبر و استقامت پر رشک آیا تھا۔ وہ اتنی سی عمر میں اتنا بڑا غم اتنے حوصلے سے سنبھال رہا تھا۔ اس نے اسے رونے دیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

"اسفند! پلیز میرے بھائی! اس طرح مت سوچو' یہ تو اصول زندگی ہیں۔ جانے والوں کو روکا نہیں جا سکتا۔"

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پلیز داؤد بھائی! مجھے رو لینے دیں۔ مجھے مت روکیے۔ میں اتنے دن سے خود کو سنبھال رہا ہوں۔ میں بہت دن سے صبر کر رہا ہوں لیکن اب اگر میں نے اپنے غم کو اندر ہی رہنے دیا تو میں مر جاؤں گا۔ میں نہیں برداشت کر سکتا۔ میں نہیں کر سکتا داؤد بھائی! میں نہیں... میں نہیں کر سکتا۔"

وہ اس سے لپٹا ہوا بول رہا تھا۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔ داؤد اس کے آنسوؤں کی نمی اپنے شرٹ کے کندھے پر محسوس کر سکتا تھا۔

"میں کبھی کسی کے آگے نہیں رویا۔ میں اپنے دکھ کی تشہیر پسند نہیں کرتا۔"

خضر کو دفن کر کے آنے کے بعد خاندان کے کسی بزرگ نے جب اسے رونے کا مشورہ دیا تھا اور اسے رلانا چاہا تھا تو اس نے کہا تھا اور آج اتنے دن گزرنے کے بعد وہ اس کے کندھے سے لگا رو رہا تھا۔

"ڈیڈ کو جانا ہی تھا تو مجھے اپنی عادت کیوں ہونے دی۔ مجھے اپنا... اس قدر... عادی کیوں بنایا۔ میں نہیں چل سکتا داؤد بھائی! میں... میں ایک... قدم نہیں چل سکتا ان کے بغیر مجھے... مجھے ان کی ضرورت ہے۔ مجھے... مجھے ان کی بہت ضرورت ہے۔ ماوی کو ان کی ضرورت ہے... اور... زینب کو بھی... ہم سب کو داؤد بھائی! ہم... ہم کیسے رہیں گے ان کے بغیر' انہوں نے... ایک دفعہ ایک دفعہ بھی نہیں سوچا۔"

وہ سسک رہا تھا۔ داؤد نے بھی اپنی آنکھوں سے نمی کو اڈتا دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"داؤد بھائی! میں... میں بہت چھوٹا ہوں۔ میں بہت چھوٹا ہوں داؤد بھائی میں تو... کسی قابل نہیں میں کیسے... میں کیسے داؤد بھائی!" وہ ہچکیاں لینے لگا تھا۔ داؤد نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ وہ اسے کھل کر رونے دینا چاہتا تھا۔

✡ ✡ . ✡

"داؤد بھائی! میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ ڈیڈ کے بغیر زندگی میں کوئی چارم نہیں ہے۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھا جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا اس کی آنکھوں کے نیچے موجود سیاہ رنگ کے حلقے اس کی نشاندہی کرتے تھے کہ وہ بہت دن سے ٹھیک طریقے سے سو نہیں پایا۔ خضر کی وفات کو اگرچہ دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن ان کی زندگیاں ابھی بھی عدم توازن کا شکار تھیں۔ داؤد خود ہی وقت نکال کر تین چار دن بعد اس سے مل آیا کرتا تھا۔ زینب عدت میں تھی اس لیے وہ اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔

"اسفند! ادھر دیکھو میری طرف۔" داؤد نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میرے بچے! بات بہت پرانی سہی لیکن ہے ایک سو ایک فیصد حقیقت پر مبنی 'مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا' زندگی بہت عجیب چیز ہے اسفند! اس کے پاؤں کو وقت کے پہیے لگے ہوتے ہیں جو اسے کسی لمحہ قیام نہیں کرنے دیتے۔ یہ زندگی ہے یہ رک نہیں سکتی اور اگر یہ رک جائے تو اسے زندگی نہیں کہتے۔"

وہ بہت محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔

"یہ رک جانا' ٹھہر جانا تو کھڑے پانی کی خصوصیات ہے اور یہ خصوصیت زندگی کو نہیں انسان کو تفویض کی گئی ہے۔ جنہیں وقت پر مر جانا ہے 'سڑ جانا ہے۔ زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو یہ خصوصیت جچتی نہیں۔ ہمہ وقت روانی اس کی خصوصیت ہی نہیں' اس کی قسمت بھی ہے۔"

وہ اپنی طرف سے اسے سمجھانے کی مکمل کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا' اس کے لبوں پر بہت بیچاری سی مسکراہٹ تھی۔

"داؤد بھائی! فلسفہ بزنس کی فیلڈ میں اپلائی نہیں ہوتا۔ میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں لیکن... میں بزنس نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے پیسہ خرچ کرنا تو آتا ہے لیکن مجھے پیسہ بنانا نہیں آتا ڈیڈ نے کبھی مجھے آفس آنے دیا نہ ہی مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد کی۔"

وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی ٹھوڑی پر پھیر رہا تھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی داؤد بھائی! میں تو بالکل اناڑی ہوں۔"

وہ کافی سے زیادہ پریشان تھا۔ داؤد خود نوکری پیشہ تھا اسے خود بھی بزنس کے اسرار و رموز سے واقفیت نہیں تھی۔

"تمہارے آسٹریلیا والے پلان کا کیا بنا؟" اس نے استفسار کیا۔

"وہ تو اب آپ ختم ہی سمجھو' فی الحال تو پینڈنگ میں ہے۔ انسٹیٹوٹ نے میری ڈیوز واپس نہیں کیں بلکہ نیکسٹ سمسٹر کے لیے ٹرانسفر کر دی ہیں۔ میں چاہوں تو اگلے سمسٹر سے سیشن جوائن کر سکتا ہوں۔"

اس کے ایک ایک انداز سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ داؤد جانتا تھا وہ اپنی تعلیم کو لے کر کس قدر سنجیدہ رہا ہے' کچھ عرصہ پہلے جب اس کا ایڈمیشن ہوا تھا تو اس کی ایکسائٹمنٹ قابل دید تھی۔

"میری مام اس انسٹیٹوٹ کی گولڈ میڈلسٹ تھیں۔"

خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے داؤد کو بتایا تھا۔ باپ کی موت نے اس کے سارے خواب سارے آدرش ختم کر ڈالے تھے۔

"زینب کیسی ہیں؟" داؤد نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا تھا' اسے ابھی تک اس لڑکی کے لیے کوئی القاب نہیں ملا تھا۔

"بہتر ہیں' ٹھیک ہیں... ان کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔ اتنی دیر انتظار کا یہ صلہ ملا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے اپنے سے زیادہ بے چاری لگتی ہیں' لیکن بہت صبر اور حوصلے والی ہیں' شکر گزار قسم کی خاتون' ہر چیز پر شاکر' میں نے کبھی ان کے منہ سے کوئی شکوہ نہیں سنا۔"

داؤد پوچھنا چاہتا تھا کہ اتنی دیر انتظار سے اس کی کیا مراد ہے مگر پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش رہا۔

"سب لوگ چلے گئے ہیں شاید؟" داؤد نے خالی

زینب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے کچھ رشتہ دار خضر کی وفات کے بعد سے ان کے یہاں ہی مقیم تھے۔"

"جی ہاں۔" وہ اکتا کر بولا۔

"سگے رشتہ دار تو تھے نہیں' ڈیڈی کے دور پار کے کزن وغیرہ تھے۔ ڈیڈ کی لائف میں کبھی یہاں آئے ہی نہیں تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد کئی لوگوں سے میں پہلی مرتبہ ملا ہوں۔"

"تمہارے چچا وغیرہ یا دادا...؟"

"سچ کہوں داؤد بھائی! ڈیڈ نے کبھی اس بارے میں مجھ سے بات نہیں کی' رشتے دار ہوں گے یقیناً" ہوں گے... زینب ہی ڈیڈ کی فرسٹ کزن ہیں لیکن ان لوگوں نے مجھے کبھی بتایا نہ ہی ملوایا۔" وہ لمحہ بھر رکا۔

"نانا' نانی آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔ یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"اس کا مطلب وہی لوگ تمہیں اسپانسر کر رہے ہیں؟" داؤد نے پوچھا۔

"سپورٹ کر رہے ہیں... اسپانسر نہیں۔" اس نے تصحیح کی۔

"ماموں چاہتے ہیں کہ میں پاکستان چھوڑ کر آسٹریلیا شفٹ ہو جاؤں۔ وہ تو ڈیڈ کے بھی پاکستان میں رہنے کے حق میں نہیں تھے لیکن ڈیڈ نے کبھی اس ضمن میں سوچا ہی نہیں تھا۔"

داؤد خاموشی سے اسے سننے لگا تھا۔ اسے اس کی گفتگو سے اس کے ارادوں کا پتا نہیں لگ پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں زینب بات کر رہی ہوں۔" اس نے خوشگوار حیرت میں گھر کر ایئرپیس کو دیکھا اس نے پہلی مرتبہ اسے خود فون کیا تھا۔

"جی... میں نے پہچان لیا... خیریت سے ہیں آپ؟"

"جی کرم ہے اللہ کا... دراصل مجھے آپ سے... ایک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جی پلیز... میں ہمہ تن گوش ہوں۔" اس نے سماعتوں کو مکمل طور پر اس کی آواز کی سمت لگایا۔

"اسفند' آسٹریلیا جا رہا ہے۔" داؤد کو اس کے لہجے میں کرب محسوس ہوا۔

"اوہ... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے... بہت مبارک ہو آپ کو۔" وہ اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔ زینب دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"جی... ہے تو خوشی کی بات' بہت خوشی کی بات ہے لیکن..." وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"آپ کو جو کہنا ہے بلا جھجک کہئے۔" اس نے کسی قدر اپنائیت سے کہا۔

"بخدا داؤد صاحب! میں اسفند کی تعلیم کے خلاف نہیں ہوں۔ میری بھی خواہش ہے کہ وہ زندگی میں اعلیٰ مقام تک پہنچے... اس کا مستقبل بہت شاندار ہو لیکن... لیکن داؤد صاحب خضر کے بعد... وہی... وہی تو ہمارا سہارا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ماشاء اللہ فائنانشلی ہم سب اسٹرونگ ہیں اور انشاء اللہ اس ضمن میں کبھی کوئی مسئلہ ہو گا بھی نہیں۔ خضر نے بہت کچھ چھوڑا ہے لیکن... لیکن روپے انسانوں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتے نا۔ انسان کی کمی تو انسان ہی پورا کر سکتا ہے آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

وہ بہت لجاجت سے کہہ رہی تھی۔ داؤد کو اس کے سارے قصے میں اپنا کردار سمجھنے میں دشواری ہوئی۔

"جی... جی میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"اسفند آپ کی بات کو بہت اہمیت دیتا ہے' آپ کی رائے اس کے نزدیک ہمیشہ اہم ہوتی ہے۔ آپ اسے سمجھائیں گے تو وہ سمجھ جائے گا۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مسز زینب! لیکن جہاں تک میں اسفند کو سمجھ پایا ہوں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے' بات وہ سب کی سن لیتا ہے لیکن کرتا وہی ہے جو اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اگر وہ فیصلہ کر چکا ہے تو وہ اس کو بدلے گا نہیں۔ وہ اس قابل ہے کہ

CamScanner

میری ہر دلیل کو اپنی بہتر اور موثر دلیل سے رد کر سکے۔"

اس نے صاف صاف ساری صورت حال اسے بتا دی تھی۔

"میں بھی اس کی فطرت سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں آپ ایک ٹرائی ضرور کریں... پلیز۔"

اس کے لہجے میں لجاجت ہی لجاجت تھی۔

"ڈونٹ وری... ایک ٹرائی تو میں ضرور کروں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ایک اور درخواست... اسفند سے میرا ذکر مت کیجیے گا پلیز۔"

"ایک بار پھر ڈونٹ وری... میں نہیں کروں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں۔"

اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ اسفند سے خود بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ شام کو اس سے ملنے آیا تھا اور اس نے اسے خوشخبری دینے والے انداز میں اپنے آسٹریلیا جانے کی بات بتائی تھی۔ وہ اتنا خوش دکھائی دے رہا تھا کہ داؤد کو سمجھ ہی نہیں آیا وہ اس سے کس طرح بات کرے۔

"اچھی بات ہے... بہت مبارک ہو تمہیں... ماوئی کی اسکولنگ تو وہیں سے ہو گی پھر...؟" اس نے جان بوجھ کر ماوئی کا نام لیا۔

"زینب اور ماوئی تو پاکستان میں ہی رہیں گے داؤد بھائی! ماموں خود بھی اگلے پانچ سال تک پاکستان شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہاں کا آزاد ماحول ہمارے گھروں کی خواتین کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں خود مستقل رہنے کی غرض سے نہیں جا رہا۔ ڈگری مکمل کر کے واپس آجاؤں گا۔"

اس کے منہ میں اس کے ماموں کی زبان تھی یقیناً" اسے بہت اچھی طرح برین واش کیا گیا تھا۔ داؤد نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا وہ جو اپنی ننھی بہن کے بغیر چار پانچ منٹ نہیں گزار سکتا تھا، چار پانچ سالوں کے لیے اس سے دور جا رہا تھا۔

"ڈیڈ نے اسٹاف بہت دیانتدار قسم کا رکھا ہوا تھا، وہ سب کے سب قابل اعتماد لوگ ہیں۔ اکنامکلی انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا داؤد بھائی! ماموں اگلے سال تک آجائیں گے تو وہ سنبھال لیں گے۔ وہ بہت اچھے بزنس مین ہیں۔"

داؤد کو اس نے تفصیل سے بتایا اور داؤد کو بہت اچھی طرح سے سمجھ آگئی تھی کہ اس کے ماموں بچ بچ بہت اچھے بزنس مین ہیں۔ اسفند کو اپنے قابو میں کر کے اس کا بزنس ہتھیا لینا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ یہ سب باتیں اسفند کو سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا اسفند یہ باتیں سمجھے گا نہیں، سمجھ جائے گا تو برا مانے گا اور بہرحال وہ اس کے بڑے بھائی جیسا ضرور تھا، اس کا بڑا بھائی نہیں۔

☆ ☆ ☆

"پاپا... پاپا... ادھر دیکھیں... وہاں ماوئی ہے اور زینب ممی بھی۔"

شہریار نے انہیں بہت عرصہ بعد دیکھا تھا اس لیے وہ خوشی سے بے قابو ہو کر چلا رہا تھا۔ داؤد نے مڑ کر اس سمت میں دیکھا اور پھر ایک گھورتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

"خاموش، کوئی ضرورت نہیں اس طرف دیکھنے کی یا انہیں مخاطب کرنے کی... اوکے"

چھٹی کا دن تھا اور وہ مکمل طور پر چھٹی منانے کے موڈ میں تھا۔ اسے نہایت ذاتی ضرورت کا سامان خریدنا تھا جیسے ٹوتھ پیسٹ، شیمپو وغیرہ اسی لیے شاپنگ سنٹر آتے ہوئے اس نے کپڑے بدلنے کا تکلف نہیں کیا تھا، کپڑے نہیں بدلے تھے تو شیو کیسے کر لیتا شکن آلود ٹی شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ گھریلو سلیپر پہنے وہ بہت مزے سے شیونگ برش دیکھ رہا تھا جب شہریار نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کروائی۔ وہ دوسری طرف گروسری وغیرہ ٹائپ شاپنگ کر رہی تھی۔ داؤد کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اسفند کو آسٹریلیا گئے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ

...یا تھا۔ اس دوران داؤد نے دو ایک مرتبہ ہی فون کر ...ن کی خیریت دریافت کی تھی چونکہ زینب خود فون کا تکلف نہیں کرتی تھی اسی لیے داؤد خود بھی ...کرتا تھا کہ یہ اسے کچھ مناسب نہیں لگتا تھا۔

...اؤد کے برعکس زینب کافی ٹھیک ٹھاک حلیے میں ...اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن مردانہ حصلت ...ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بھرپور نگاہ ضرور ڈالی ...وہ سیاہ رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور ...رنگ اس پر بچ بھی بہت رہا تھا۔ داؤد رضا فیصلہ ...نہ کر پایا کہ وہ سیاہ رنگ کی وجہ سے خوب صورت ...دکھائی دے رہی ہے یا سیاہ رنگ اس کی وجہ سے ...آنکھوں کو اتنا بھلا محسوس ہو رہا ہے۔

"پاپا! آئیے ناں ان سے ملتے ہیں۔" شہریار نے اس کی ...انگلی کھینچی۔

"خاموش، پاپا کے بچے!" اس نے شہریار کے منہ پر ...ہاتھ رکھا۔ اتنے خراب حلیے میں وہ کم از کم اتنی خوب صورت خاتون سے نہیں مل سکتا تھا جبکہ شہریار کی بے ...چینی قابل دید تھی۔

"پاپا! پلیز..." وہ التجا پر اتر آیا تھا۔

"شیری! یار! ٹرائی تو انڈر اسٹینڈ، میں نے شیو نہیں ...کی ہوئی۔" وہ نادم لہجے میں بولا۔

"...کوئی بات نہیں، میں نے بھی تو نہیں کی، وہ ڈانٹیں ...گی تھوڑا ہی۔"

"مجھے پتا ہے میرے باپ! اب چلو یہاں سے" وہ ...بولا۔

اس سے پہلے کہ شہریار پر قابو پایا جاتا وہ انگلی چھڑوا کر "زینب ممی" چلاتا ہوا اس طرف لپکا اور لمحے بعد ہی وہ ...ان کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے کے ...مصداق وہ بھی اسی طرف آ گیا۔ سب سے زیادہ ...شرمندگی اسے اپنے پاؤں میں پہنے ہوائی سلیپر سے ہو ...رہی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے بہت بیچارگی سے کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ خود شہریار کے اس والہانہ ...حرکت سے کچھ بوکھلا سی گئی تھی۔

"یہ شہریار... دراصل... تنگ کر رہا تھا... میں اس کو۔" دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو اس نے موٹی سی گالی سے نوازا تھا۔ وہ اس لمحے خود کو باپ کی بجائے کڈنیپر محسوس کر رہا تھا۔

"اٹس اوکے داؤد صاحب! بچہ ہے۔" مسکراتے ہوئے جیسے اسے اطلاع دی گئی تھی۔

"مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟" وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ داؤد کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔

"کس کمبخت نے کہا تھا اتنے خراب حلیے میں مارکیٹ آنے کو، اب خود ہی بھگتو۔" اس نے خود سے کہا تھا۔ سر جھکائے کچھ کنفیوز اور پزل سا داؤد، زینب کو تحیر میں مبتلا کر رہا تھا۔

"پاپا... زینب ممی نے پوچھا ہے کہ..." اسے شاید لفظ مزاج سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس لیے بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"جی... جی... ہاں جی... بالکل ٹھیک۔"

وہ بڑبڑا کر بولا، نظریں مسلسل ہوائی چپل کو گھور رہی تھیں۔

"آپ... آپ کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں... خوش ہوں۔" بہت پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔ داؤد نے اس کے چہرے پر پھیلے حزن و ملال کو بغور دیکھا۔

"آپ اکیلی ہیں؟" اس نے ہوائی چپل کو بھلا کر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں... یہ ماوئی جو ہے۔" اس کی بات پر داؤد مسکرایا۔

"میرا مطلب ہے اگر آپ اکیلی ہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں، بہت شکریہ... میں کیب سے چلی جاؤں گی، میں کیب سے ہی آئی تھی۔" وہ اب مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ کہاں لکھا ہے کہ اگر آپ کیب سے آئی تھیں تو واپس بھی کیب سے جائیں گی۔"

اب کی بار وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائے تھے۔ گھر کے آگے اتر کر زینب نے اسے چائے کی آفر کی تھی۔ شہریار فوراً اندر جانے کو تیار تھا لیکن داؤد کی کڑک نگاہ سے گھبرا کر بولا۔

"نہیں زینب ممی! ابھی ہم گھر جائیں گے پھر شیو کر کے آئیں گے۔"

زینب نے پہلے اس کی طرف دیکھا پھر داؤد کے ان شیوڈ چہرے کی طرف دیکھ کر سب سمجھ گئی تھی۔ ان کے چہروں پر پھیلی مسکراہٹ، ہنسی میں بدل گئی تھی۔ تابوت میں شاید پہلا کیل لگا تھا۔

اسفند نے ایک روٹین بنا رکھی تھی، ہر روز بچوں کو گھمانے لے جانا یا پھر ان ڈور گیمز میں ہی ان کو مصروف رکھنا، خضر کی وفات اور اسفند کی آسٹریلیا روانگی نے اس روٹین کو بالکل چوپٹ کر دیا تھا۔ داؤد ہر ویک اینڈ پر شہریار کو آؤٹنگ کے لیے ضرور لے جاتا تھا۔ اسفند کے جانے کے بعد وہ ماوئی کو بھی لے جانے لگا اس طرح سے ویک اینڈ پر وہ اپنا سارا وقت ان دو بچوں پر ہی صرف کر دیتا۔ کبھی سندباد، کبھی سوزو ورلڈ، ایک بار بچوں کے لیے پیٹس کی اگزیبیشن لگی تو وہاں بھی لے گیا۔ اس دوران اس نے کبھی زینب کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی اور زینب نے بھی کبھی ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ماوئی کو لینے گھر جاتا، گیٹ پر ہی ہیلو، ہائے ہوتی، پھر واپسی پر وہ ماوئی کو چھوڑ کر گیٹ پر ہی بائے، شائے کہہ کر واپسی کی راہ لے لیتا۔ زینب بہت محتاط زندگی گزارنے کی عادی تھی یہ داؤد کو بہت شروع میں ہی پتا چل گیا تھا اس لیے وہ خود بھی بہت دھیان رکھتا تھا۔

اس روز وہ شہریار کو ہوم ورک کروا رہا تھا جب نوٹ بک نکالتے ہوئے اس کے بیگ سے چاکلیٹ برآمد ہوئی۔ ریپر میں ادھ کھائی چاکلیٹ تھی۔

"یہ باؤنٹی کس نے دی؟" ایسی چیزیں وہ خود اسے دلاتا تھا اور یہ چاکلیٹ اس نے اسے نہیں دی تھی اس لیے کسی قدر حیرانگی سے پوچھا۔

"ماوئی نے۔"

"ماوئی نے؟ کیوں؟"

"اس کا برتھ ڈے جو تھا۔ اس نے سب فرینڈز کو دی ہے۔"

"آپ نے اس کو وش کیا؟"

"نہیں۔" شہریار کی ساری توجہ میتھس کے سوالوں پر تھی۔

"کیوں؟"

"یاد ہی نہیں رہا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"اچھا... ابھی کتنا ہوم ورک باقی ہے؟" وہ کچھ سوچنے والے انداز میں بولا۔

"تھوڑا سا، میتھس کا۔"

"اوکے، جلدی سے کر لو پھر ماوئی کے گھر چلتے ہیں۔"

"پھر سندباد؟" شہریار خوش ہوتے ہوئے بولا۔ داؤد کو ہنسی آ گئی۔

"نہیں شیطان، اس کا برتھ ڈے ہے، اس کو وش کرنے چلتے ہیں۔"

"ہاں... ٹھیک ہے۔" گھر سے باہر جانے کو وہ ہمیشہ ہی تیار رہتا تھا۔

آدھ گھنٹہ بعد ہی وہ شیزان بیکرز سے کیک اور ضروری لوازمات لے کر ان کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ زینب کے بارے میں داؤد اندازہ نہیں لگا سکا تھا لیکن ماوئی ان کی آمد سے بہت خوش تھی۔ خوشی سے پھدکتا ہوا وہ ننھا منا کھلونا داؤد کو بذاتِ خود بہت خوش کر رہا تھا اور جو تھوڑی بہت جھجک وہ آنے سے پہلے محسوس کر رہا تھا وہ دھیرے دھیرے زائل ہو رہی تھی۔

"آپ نے خوامخواہ تکلف کیا۔ ماوئی ضدی نہیں ہے۔ میں اسے بہلا چکی تھی۔"

کیک وغیرہ کے بعد دونوں بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے تو زینب نے کہا۔

"درست فرمایا آپ نے... اور کچھ؟"

جانے کیوں داؤد کو اس کی بات پسند نہیں آئی لیکن وہ اپنے تاثرات چھپا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ زینب

...جل سی ہو گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ...نی جلدی مان لی جائے گی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟" وہ اب بھی مسکرا ...نا۔ زینب پزل سی ہو گئی۔

...لمحوں کے لیے خاموشی کا دبیز پردہ ان دونوں کا بیچ ...ن رہا۔

"موسم بہت بدل گیا ہے زینب! آج کل شام کو ...چھی ہوا چلتی ہے۔ آپ نے ساری کھڑکیاں بند ...رکھی ہیں، انہیں کھول دیجیے، تازہ ہوا کو اندر آنے ...دیجیے زینب!"

لاؤنج کا تفصیلی جائزہ لے کر اس نے ٹھنڈی آہ ...تے ہوئے کہا تھا۔ زینب بچی نہیں تھی جو اس ...نی بات کو سمجھ نہ پاتی۔ اس نے ایک نظر داؤد کو ...کھا پھر سر جھکا کر بولی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟ ہوا سے؟"

"ہاں ہوا سے، ہوا موافق نہ رہے تو ڈرانے لگتی ہے۔"

داؤد کو اس کی آواز میں نمی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا زینب!" اس کے انداز میں حد درجہ اپنائیت تھی، یہ شاید اسی اپنائیت کا اثر تھا کہ زینب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ داؤد اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ صد شکر کہ دونوں بچے ان کی طرف متوجہ نہیں تھے اسے کسی روتی ہوئی خاتون کو چپ کروانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ...تو وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے ...کچن سے پانی لایا، اسے پلایا اور پھر بولا۔

"مجھے اپنا دوست سمجھو اچھی لڑکی! اگر کوئی پرابلم ہے تو میرے ساتھ شیئر کرو۔"

"آئی ایم سوری، آئی ایم ریئلی ویری سوری۔" وہ ...بچاری الگ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

"اس لو کے زینب! پلیز، اسفند نے مشکل وقت ...میں میرا ساتھ دیا تھا، اس کا احسان ہے مجھ پر، اس کے حوالے سے ہی آپ مجھے اپنا دوست سمجھ کر اپنا مسئلہ مجھے بتا سکتی ہیں شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔"

وہ ابھی بھی بہت اپنائیت سے بات کر رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ میں بہت بہادر لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے تاریکی سے تنہائی سے خوف آتا ہے۔ خضر کے بعد زندگی مشکل نہیں، بہت مشکل ہو گئی ہے۔ اسفند... وہاں جا کر جیسے ہمیں بھول ہی گیا ہے۔"

اس نے پھر سسکی لی۔ وہ بے ربط بول رہی تھی۔

"فون وغیرہ نہیں کرتا وہ؟" داؤد کو اسفند کے رویے نے حیرت میں مبتلا کیا۔

"فون کٹ چکا ہے۔" اس کی آواز میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

"واٹ؟ کیوں؟"

"میں نہیں جانتی، شاید دو ماہ سے بل پے نہیں ہوا۔ پہلے بھی سب بلز وغیرہ خضر کے منیجر ہی دیکھتے تھے۔ اسفند... جانے سے پہلے اس قسم کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کر گیا تھا لیکن... وہ اچھے آدمی نہیں ہیں داؤد صاحب! وہ بالکل اچھے آدمی نہیں ہیں۔" اس نے رک کر سانس لیا۔

"اسفند نے کہا تھا وہ مجھے ہر ماہ ایک مخصوص رقم خود دے جایا کریں گے، لیکن پچھلے دو ماہ سے وہ کہیں غائب ہیں۔ میرے پاس روپے ختم ہو رہے ہیں۔ ملازم بھی سب کام چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔"

داؤد نے دیکھا مطلع پھر ابر آلود ہونے لگا تھا۔ بات سچ مچ پریشان کن تھی۔

"اللہ کو بھول گئیں آپ؟ جس کے ساتھ خدا ہو وہ کبھی اکیلا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ آپ کی پریشانی برحق ہے لیکن ہر مسئلہ ختم ہو جانے کے لیے ہی پیدا ہوتا ہے۔ آپ فکر مت کیجیے میں صبح ہی انکوائری کرواتا ہوں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے اسے تسلی دی تھی، اٹھنے سے پہلے وہ اسفند کا کانٹیکٹ نمبر لینا نہیں بھولا تھا۔ وہ زینب کو کچھ روپے بھی دینا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ یہ

روپے کبھی نہیں لے گی اس لیے یہ ارادہ ترک کر کے وہ وہاں سے اٹھ آیا۔ گھر آتے ہی سب سے پہلا کام جو اس نے کیا' وہ اسفند کو آسٹریلیا فون تھا۔

"اسفند اب یہاں نہیں رہتا' وہ یہاں سے جا چکا ہے۔"

ایک لمبی انکوائری کے بعد اسے جواب دیا گیا تھا۔

"کہاں؟" جب اس نے یہ سوال کیا تو دوسری طرف موجود شخص نے لاعلمی کا اظہار کر کے ٹھک سے فون بند کر دیا تھا۔ صورت حال سچ مچ پریشان سے پریشان ترین ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں خود سمجھ نہیں پایا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ آفس پچھلے کئی دنوں سے بند ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس فرم کے مالک کا بیٹا سب کچھ بیچ باچ کر یورپ جا چکا ہے جبکہ اسفند نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسے سارے ورکرز پر اعتبار تھا۔"

اس نے لمحہ بھر کو رک کر زینب کی شکل دیکھی۔ اسے اس پر ترس آیا تھا۔

"میں نے اسفند کو فون کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میری ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ کال ہی نہیں ملتی۔ میں آج بھی ٹرائی کروں گا۔"

داؤد نے مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ اتنا جھوٹ ایسی صورت حال میں جائز تھا۔

زینب کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نے ذرا کی ذرا جلوہ دکھایا۔

"آپ مجھے بہلانا چاہتے ہیں تو میں بہل جاتی ہوں لیکن۔۔۔ پلیز مجھ سے جھوٹ مت بولیے۔ میں نے آج صبح ہی پی سی او سے آسٹریلیا فون کیا تھا۔ اسفند کے ماموں نے کہا ہے کہ اسفند مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ آفس Sale ہو چکا ہے اور بینک اکاؤنٹ میں چند ہزار کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اکاؤنٹنٹ نے مجھے دس ہزار کا چیک واپس کرتے ہوئے خود کہا ہے کہ اس اکاؤنٹنٹ میں اتنے روپے نہیں ہیں جتنے کا چیک میں لے کر آ گئی ہوں۔" وہ بہت صبر سے کہہ رہی تھی۔

"فاختہ کا چہرہ بھی ایسا ہی ہو جاتا ہو گا جب سانپ اس کے سارے انڈے پی جاتا تھا۔"

داؤد نے دل ہی دل میں سوچا۔ بچپن کی پڑھی کوئی کہانی ذہن کی نہاں خانوں سے نکل کر ناچنے لگی تھی۔

"میں پھر بھی بہل جاتی ہوں' میں پھر بھی مسکرا دیتی ہوں لیکن پلیز داؤد صاحب سچ بولیے' آپ کا بولا گیا جھوٹ چاہے بہت تلخ ہو' بہت تکلیف دہ ہو' لیکن یہ سچ مجھے حقیقت پسند اور بہادر بنا دے گا۔ مجھے بہادر بننے دیجیے داؤد صاحب بزدل لوگوں کا سروائیول ناممکن ہوا کرتا ہے۔ مجھے سروائیو کرنا ہے اپنی بچی کے لیے۔"

داؤد نے دل ہی دل میں اس کے جذبے کو سراہا تھا۔

"آپ خود بھی صورت حال کو سمجھئے اور پلیز مجھے بھی سمجھنے دیجیے۔ اسفند نے روانگی سے قبل مجھے آفس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ اسے تمام ورکرز پر مکمل اعتبار تھا۔ یہ کوئی لمبا ہی کھیل ہے۔"

وہ سچ مچ اس جگسا پزل کو سلجھانا چاہتا تھا۔

"لمبا کھیل' لمبی پلاننگ' لمبا ہاتھ اور لمبا دھوکہ' جو بھی ہے اللہ کی مرضی کے تحت ہے۔ میں اس کی مرضی کے خلاف تو نہیں چل سکتی۔ دولت کا کیا ہے آج ہے کل نہیں ہے۔ مجھے روپوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرے اور اسفند کے جوائنٹ اکاؤنٹ سے چیک واپس آیا ہے لیکن میرے ذاتی اکاؤنٹ میں ابھی بھی کافی رقم ہے۔" اس نے توقف کیا پھر بولی۔

"اسفند کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں جانتی ہوں وہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ یہ سب اکیلے نہیں کر پائے گا لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنی جلدی تھک جائے گا اتنی جلدی اتنی جلدی کہ سب چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔"

داؤد کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ تسلی کے دو بول کیسے بولے کرے۔ زینب نے اس کی مشکل خود ہی آسان کی

"جو ہوا بہتری کے لیے ہوا' آپ۔۔۔ آپ میرا ایک کام کردیجیے۔ قابل بھروسا اور شریف فیملی ڈھونڈ دیجیے میں گھر کا آدھا حصہ کرائے پر دینا چاہتی ہوں۔" ایک یہی حل مناسب ترین تھا۔

"آپ فکر نہیں کریں' میں یہ کام انشاء اللہ بہت جلد کروں گا۔ مسز رحمن بہت اچھی اسٹیٹ ایجنٹ ہیں۔ میں آج ہی ان سے بات کروں گا۔"

وہ اس کے مسائل کو ذاتی مسائل کے طور پر لے رہا تھا۔ وعدہ کے عین مطابق اس نے بہت جلد اسے کرایہ دار ڈھونڈ دیے تھے۔ زندگی ون وے ٹریفک تو کسی کے لیے بھی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو ہی چھوٹی موٹی پریشانیوں سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اس بات کا اندازہ زینب کو بہرحال بہت اچھی طرح تھا۔ اس نے زندگی میں شکوہ کرنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ زندگی کو زندگی کی طرح گزارنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں داؤد نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اس نے اس کی کافی ذمہ داریاں بانٹ لی تھیں اور اسے لگتا تھا وہ یہ سب انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کر رہا ہے۔ دو انجان لوگوں کے بیچ کا تعلق شاید سب سے پہلے ہمدردی کی شکل میں ہی سامنے آتا ہے پھر یہ ہمدردی مختلف شکلیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے نہاری بنائی ہے' اتفاق سے کافی اچھی بن گئی ہے۔ اگر آپ ناشتا کر چکے ہیں تو آپ کی قسمت' لیکن اگر ابھی نہیں کیا تو آجائیے مزیدار نہاری آپ کی منتظر ہے۔"

اتوار کے روز ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے فون کیا تو زینب نے ہنستے ہوئے اسے دعوت دی تھی۔ وہ ناشتا کر چکا تھا اور اسے نہاری' پائے' جیسے کسی ناشتے سے کوئی شغف نہیں تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اس نے کہا۔

"اتنی اچھی آفر ہو اور میں انکار کردوں۔۔۔ ہرگز نہیں' آپ بگھار دیجیے میں نان لے کر ابھی آتا ہوں۔"

چھٹی والے دن شام تک کپڑے نہ بدلنے والا داؤد رضا دس بجے ہی نہا دھو کر نک سک سے تیار نہاری کھانے پہنچ گیا تھا۔

"نہاری' ہڈیوں کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ اگر جوڑوں کا درد ہو تو اس کے کھانے سے افاقہ رہتا ہے جیسے سوپ وغیرہ' آپ اسے دیسی سوپ سمجھ لیجیے۔"

ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ کھانے کے ساتھ ساتھ نہایت تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"کیا یہ مجھے پچاس سال کا سمجھتی ہے جو جوڑوں کے درد کی بات کر رہی ہے۔" داؤد نے خود سے کہا تھا۔

"بائی داوے آپ دودھ پیتے ہیں نا' دودھ بھی اچھا ہوتا ہے' رات کو ایک گلاس ضرور پیا کیجیے۔"

"یہ لڑکی کتنی اچھی لگے اگر میری ماں بننے کی کوشش نہ کرے تو۔" اس نے سوچا۔

"شیری مجھے بتا رہا تھا آپ بارش میں نہائے تھے۔ ایسا مت کیا کیجیے۔ یہ ساون کی بارش ہوتی تو اچھی ہے لیکن اپنے ساتھ نزلہ زکام کے وائرس ضرور لاتی ہے۔"

"ذرا سے نزلہ زکام سے میں مر نہیں جاؤں گا میری ماں!" اس نے ایک بار پھر سوچا۔ اسے اس کی باتوں سے کوفت ہونے لگی تھی جبکہ وہ مگن انداز میں کہہ رہی تھی۔

"صحت کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اب ایسے تھوڑا ہی کہ۔۔۔"

"شٹ اپ زینب!" اس نے جھنجلا کر مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ زینب کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"میری ماں کا انتقال دو سال پہلے ہو گیا تھا۔ مجھے ان سے بہت محبت تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر عورت کو ماں سمجھنے لگوں۔"

وہ بہت بیچارگی سے کہہ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ لیکن میں آپ کی بات سمجھ نہیں پائی۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"آپ میری ماں نہیں ہیں تو میری ماں بننے کی کوشش کیوں کرتی ہیں۔ میں آپ کا پانچ چھ سال کا بیٹا تو نہیں ہوں پھر آپ مجھے ایسے ٹریٹ کیوں کرتی ہیں۔ آپ کا رویہ دن بدن ایسا ہوتا جا رہا ہے جیسے آپ مجھ سے بیس سال بڑی ہوں۔"

"آپ کو شاید برا لگا لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ نہیں۔۔۔"

"برا لگا؟ ارے بہت برا لگا۔۔۔ بہت برا لگتا ہے۔۔۔ بہت ہی برا لگتا ہے۔ ہم برابری کی سطح پر آکر بھی تو بات کر سکتے ہیں' دوستوں کی طرح لیکن آپ مجھے شاید دوست نہیں سمجھتیں۔"

وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر بولا۔ زینب نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ اس نے ٹیبل سے برتن اٹھا کر کچن منتقل کرنے شروع کر دیے تھے۔ اسے احساس تھا وہ داؤد کی نظروں کے حصار میں ہے۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ سب بکواس کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں آپ سے ایکسکیوز کرتا ہوں۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر بولا۔

اس کا بچوں کی طرح لٹکا منہ دیکھ کر زینب کو ہنسی آ گئی۔

"یہ بات نہیں ہے۔ آپ نہیں سمجھیں گے لیکن میرا رویہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسفند کے ساتھ بھی۔۔۔"

"میں اسفند نہیں ہوں زینب! میں جانتا ہوں آپ کا رویہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے' ایسا جیسے آپ سب کی بزرگ ہوں' سب کی اماں۔۔۔ مدر ٹریسا۔"

"مدر ٹریسا۔۔۔ میں اتنی بوڑھی نہیں ہوں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ داؤد نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

"کسی نے سچ ہی کہا ہے سب خواتین عمر کے معاملے میں ایک سی ہوتی ہیں۔" وہ اس کی بات کا مزا لے کر بولا۔ زینب کی شکل دیکھنے والی تھی۔

"اچھی لڑکی! کیوں اپنے آپ کو بوڑھی بنانے پر تل گئی ہو۔ زندگی چار روزہ ہے اور یہ چار دن' دو آرزو' دو انتظار میں کاٹنے کے لیے نہیں ہوتے۔"

وہ ناصح بن کر بولا۔

"خضر کے ساتھ سب ہی ختم ہو گیا۔" وہ سر جھکائے بہت بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ ماضی کے کچھ اچھے پل دونوں کی یادوں میں آج بھی زندہ تھے۔

"مریم کے ساتھ بھی سب ختم ہو گیا تھا اور سب ختم ہی رہتا اگر میں ختم ہو جاتا' لیکن۔۔۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں ختم نہیں ہوا تھا اور مجھے وقت سے پہلے ختم نہیں ہونا تھا۔ آپ بھی وقت سے پہلے ختم نہیں ہوں گی۔ ہم سب اپنی بدت ضرور پوری کریں گے۔ جب تک ہماری ہیٹری فیل نہیں ہو جاتی ہمیں چلنا ہے' متحرک رہنا ہے' یہی زندگی ہے زینب! یہی اصول خداوندی ہے۔"

"یہ رب کے اصول ہی تو ہیں جو کبھی بھی مجھے سمجھ نہیں آتے۔ وہ جانتا تھا کہ میرا اور خضر کا ساتھ بس تین چار سال تک ہی ہے تو۔۔۔ تو پھر اس نے مجھے اتنا انتظار کیوں کروایا۔ میں کیوں آر یا پار لٹکی رہی۔"

اس کا یہ شکوہ کناں انداز داؤد نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور پہلی ہی مرتبہ اس نے اپنے ماضی کے متعلق کوئی بات کی تھی۔ داؤد نے اس پر بہت گہری نظر ڈالی تھی' سوچتی ہوئی کھوجتی ہوئی۔

"ایک بات پوچھوں زینب!" اس کی بات پر زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یو آر ٹوینگ اور۔۔۔ میرا مطلب ہے خضر صاحب کی اور آپ کی عمر میں کافی۔۔۔ کافی سے زیادہ ڈیفرنس تھا۔ آپ دونوں ہی ایجوکیٹڈ' روشن خیال لوگ تھے۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ بے جوڑ شادی۔"

وہ خاموش ہی رہی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ آئی نو۔۔۔ اٹس ٹو پرسنل۔۔۔ اوکے۔۔۔ لیوائٹ۔" خود ہی عیسی خود ہی موسی وہ خاموش ہو گیا۔

"خضر میرے فرسٹ کزن تھے۔ جب میں ایک سال کی تھی تو میرا نکاح خضر کے ساتھ کر دیا گیا تھا تب

خضر کی عمر انیس بیس سال ہوگی۔ دادا دادی ایسا چاہتے تھے اس لیے ہمارے پیرنٹس نے چوں چرا کیے بغیر ایسا کردیا۔ میں تب بولنے کیا سوچنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ خضر ان دنوں U.E.T میں پڑھتے تھے ہم لوگ گاؤں میں رہتے تھے جبکہ خضر یہاں لاہور۔ اپنی کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ تھے جو آسٹریلوی نژاد پاکستانی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔" اس نے لمحہ بھر کو رک کر سانس لیا۔

"ان کے ان لازنے پھر ان کو بہت سپورٹ کیا۔ یہ دوسری شادی کر کے آسٹریلیا چلے گئے۔ کافی عرصہ وہاں رہے۔ اسفند پیدا ہوئے تو دوبارہ پاکستان آگئے اسفند دو سال کا تھا تو ان کی وائف کا انتقال ہوگیا۔ دراصل خضر کچھ سرپھرے واقع ہوئے تھے۔ خاندان والوں سے دوبارہ ملنے کی انہوں نے کوئی کوشش ہی نہیں کی کافی عرصہ بعد انہیں میرا خیال آیا تو خاندان والوں سے رابطہ کیا۔ دادا دادی وفات پا چکے تھے تب، میرے والدین بھی حیات نہیں رہے تھے۔ ان کے والد نے کہا کہ اگر زینب کو طلاق دی تو میں اس کی شادی قرآن سے کردوں گا۔ جائیداد خاندانی جھگڑے یونو۔" وہ پھر رکی۔

"اوہ۔۔۔ یہ تو بہت ظلم ہوا۔۔۔ یہ تو گناہ کے زمرے میں ہی آتا ہے۔"

داؤد نے تاسف سے کہا۔

"خضر مجھے رخصت کروا کر گھر لے آئے۔ تب انہوں نے میرے آگے آپشن رکھی تھی کہ اگر میں چاہوں تو وہ میری شادی کہیں اور کروا سکتے ہیں لیکن۔۔۔ میں نے انکار کردیا۔ اتنی سی رام کہانی ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی۔

"آپ نے اتنے عرصہ انتظار کیا تھا خضر کا، آپ کو محبت ہوگئی ہوگی۔۔۔ ہے نا۔" انتہائی احمقانہ سوال پوچھا تھا اس نے زینب بے وجہ مسکرادی۔

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ میں نے کبھی سوچا نہیں۔"

اس کے جواب سے داؤد کو عجیب سے تاثرات کا شکار ہونا پڑا لیکن وہ خود بھی اپنی کیفیت سمجھ نہیں پایا تھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا زینب اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

"یہ کون تھے؟ بہت زیادہ آتے جاتے ہیں آپ کے یہاں، بھائی ہیں آپ کے؟" گیٹ پر اس ثمینہ (کرایہ دار) نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ بھائی تو۔۔۔"

"کزن ہوں گے۔۔۔ خیر میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنستی اپنے حصے کی طرف چل دی۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ ثمینہ کے اکثر سوالات ایسے ہی ہوتے تھے۔ پہلی دفعہ جب اس نے یہ بات کی تھی تو زینب نے دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ ان سوالات کی نوعیت اور تعداد میں ترمیم واضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

"زمانے والوں کو روکا نہیں جاسکتا لیکن خود کو تو روکا جاسکتا ہے۔"

لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مریم! تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ، ایسے تو کوئی نہیں کرتا، زندگی کی آخری منزل تک ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانا اور پھر راستے میں ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجانا۔۔۔ یہ تو وفا نہیں ہے۔۔۔ یہ تو وفا کی ابتدا بھی نہیں ہے۔"

کسی خیال کے زیر اثر اس نے خود سے کہا تھا۔

شہریار اس کے سینے پر سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا اور خود اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

آج کل اسے مریم کی یاد کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ اگرچہ اس کی وفات کے بعد سے کوئی دن ہی ایسا گزرتا تھا جب وہ اسے یاد نہیں کرتا تھا لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ یاد ایک عجیب سی شدت اختیار کررہی ہے۔ مریم اس کی فرسٹ کزن تھی اس نے اس لڑکی سے بہت محبت کی تھی، بہت ٹوٹ کر چاہا تھا اسے، شادی کے بعد اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے دنیا میں ہی جنت مل گئی ہے۔

"میں مریم سے محبت نہیں کرتا تھا، میں اس کی عبادت کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور کیسے لے سکتا ہے۔"

مریم کی وفات کے بعد جب اسے پہلی بار دوسری شادی کا مشورہ دیا گیا تو اس نے کہا تھا اور تب سے اب تک وہ اسی ایک بات پر ڈٹا رہا تھا، مگر اب تین سال کے بعد صرف تین سال کے قلیل عرصہ بعد اسے لگا تھا کہ کوئی ہے جو بہت غیر محسوس طریقے سے مریم کی جگہ لینے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے شب و روز عجیب سی بے کلی میں کٹنے لگے تھے اور وہ اس بے کلی کو مریم کی یاد کہہ کر اپنے دل کی خواہشات کو تھپکنے کی کوشش کرتا تھا اور ناکام ہوجاتا تھا۔ وہ بخوبی آگاہ تھا اس کی دھڑکنیں کس کا راگ الاپنے لگی ہیں، کس کے نام کی تسبیح کرنے لگی ہیں۔ کون ہے جو اس کے ہوش و حواس پہ سوار ہوگیا ہے، کون ہے جس کی ہمراہی کے خواب اس کا دل دیکھا کرتا ہے۔ پچھلے تین سال سے وہ ہر خواہش سے دستبردار ہوچکا تھا اور اب ہر خواہش بہت غیر محسوس طریقے سے جاگنے لگی تھی۔

وہ بازار جاتا تھا تو اس کا دل چاہتا کسی بوتیک میں گھس کر بہت اچھا سا اپنے پسندیدہ رنگ کا لباس خریدے، کسی جیولرز شاپ سے جیولری خریدے۔ کس کے لیے۔۔۔ سوالیہ نشان۔۔۔ بن جاتا۔

کسی بہت اچھے سے ریسٹورنٹ کے آگے سے گزرتے ہوئے دل چاہتا، اندر جائے اور کینڈل لائٹ ڈنر کرے، کس کے ساتھ۔۔۔ سوالیہ نشان بن جاتا۔

وہ گھر جائے تو کوئی بہت سج سنور کر، چہرے پر میٹھی مسکان جگائے اس کا انتظار کررہا ہو۔۔۔ کون۔۔۔ سوالیہ نشان بن جاتا۔

یکدم ہی بہت سے سوالیہ نشان اس کی زندگی میں در آئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ صرف ایک نام لینے سے یہ سارے سوالیہ نشان غائب ہوجائیں گے، اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ اس کے باوجود وہ یہ نام لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا وہ دھتکار دیا جائے گا اور اسے اپنی عزت بہت پیاری تھی۔

"ایسی کیا بات ہے آخر خاتون میں کہ ان کے متعلق اتنا زیادہ سوچنے لگا ہوں میں۔"

پہلی بار یہ صورت حال پیش آئی تو اس نے خود سے استفسار کیا تھا۔

"وہ بہت خوب صورت ہے۔" خود سے سوال کیا تھا تو جواب بھی خود ہی دینا تھا۔

"سو واٹ؟ خوبصورت تو جوڈی فوسٹر بھی بہت ہے، تو کیا میں اس سے بھی محبت کرنے لگوں؟"

"یعنی تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟" اندر سے سوال اٹھا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ۔" اس نے خود کو گھرک کر کہا تھا اندر خاموشی چھا گئی تھی لیکن یہ خاموشی بہت عارضی تھی۔ اسے جب بھی اس کی کوئی بات یا عادت اچھی لگتی تو اس قسم کے سوال اس کے اندر سر اٹھانے لگتے، ہر بار وہ شدت سے "شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ" کہہ دیتا لیکن دھیرے دھیرے اس کی آواز میں یہ کہتے ہوئے غصہ اور دبدبہ کم ہونے لگا اور اس کی جگہ جھنجلاہٹ اور پھر بے بسی نے لے لی۔ "شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ" تبدیل ہو کر "ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ شاید" اور پھر ایک دن اچانک یقیناً" میں تبدیل ہوگیا۔ خطرے کی گھنٹی بھی اسی دن بجی تھی۔

"یہ محبت کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ضرورت ہوسکتی ہے۔ یہ ضرورت ہی ہے۔ میں خود غرض ہوتا جارہا ہوں۔ اپنی ضرورت کو محبت کا نام دے رہا ہوں۔"

"نہیں اسٹوپڈ! تم محبت کو ضرورت کا نام دے رہے ہو۔"

کوئی چیخ کر بولا تھا اسی روز داؤد رضا نے اس چیخ پر بہت بے بسی سے لبیک کہہ دیا تھا۔ جو بھی تھا صحیح تھا، غلط نہیں تھا۔ محبت تھی یا ضرورت، جائز تھی، برحق تھی داؤد کو اپنے بیٹے کے لیے ماں کی ضرورت تھی اور اسے اپنی بیٹی کے لیے باپ کی۔ ان دونوں کو پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کے لیے محبت کی ضرورت تھی۔

"میں محبت کرنے لگا ہوں۔" مرد کو یہ اعتراف بہادر بنا دیتا ہے لیکن اگر یہ اعتراف پہلی بار ہو تو' دوسری تیسری بار میں کچھ عشق تھا' کچھ مجبوری تھی والی صورت حال ہو جایا کرتی ہے۔ داؤد کے ساتھ بھی کچھ کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے کیونکہ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔"

بستر پر لیٹے لیٹے اس نے آخر اعتراف کر ہی لیا تھا۔ شہریار کو اپنے سینے سے پہلو میں منتقل کر کے اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی فریم کی تصویر اٹھائی تھی کچھ دیر اس تصویر کو بغور تکنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے وہ تصویر سائیڈ ٹیبل کا نچلا کیبنٹ کھول کر اس میں رکھ دی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں پھیلی جامد خاموشی کو فون کی بیل نے توڑا چند لمحوں تک فون کی بیل مسلسل بجتی رہی پھر اپنی ناقدری پر مایوس ہو کر خاموش ہو گئی۔ ایک دو منٹ کے وقفہ کے بعد موبائل فون کی بیپ گنگنائی تھی اور اس دفعہ داؤد رضا سابقہ رویہ نہ روا رکھ سکا۔ نیند تو اس کی فون کی گھنٹی نے ہی توڑ ڈالی تھی' موبائل فون نے تو صرف مدہوشی کے سحر سے آزاد کیا تھا۔

"ہیلو۔" بھاری مردانہ آواز کے جواب میں صرف سسکیاں سنائی دیں۔ اس نے پریشان ہو کر پوزیشن تبدیل کی اور لیمپ آن کیا۔

"ہیلو... ہیلو... ہو زدیس... ہو زدیئر۔" اس نے یکے بعد دیگرے یہی سوال دہرایا اور ہر دفعہ کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ سسکیوں کی آواز کے ساتھ اس کی سماعت کو منتشر کر کے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

"اوہ مائی گاڈ... زینب... زینب... یہ آپ ہیں ناں؟ بولیے پلیز زینب۔"

اب کی بار وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ موبائل فون کی اسکرین پر لمحہ پہلے فلیش ہونے والا نمبر اس کے لیے اجنبی تھا جبکہ آواز سے وہ بخوبی آشنا تھا۔

"پلیز زینب! رونے مت... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کہاں ہو اس وقت؟"

اس کا انداز بے حد التجائیہ تھا۔ مرد آنسو برداشت نہیں کرتا' عورت کے آنسو تو بالکل نہیں اور خاص طور سے وہ عورت جس سے وہ محبت کرتا ہو' اس کے آنسو تو ہرگز نہیں کچھ لوگوں کا آپ کی زندگی میں شامل ہو جانا' زندگی کے سرمایہ میں اضافہ کے برابر ہوتا ہے۔ زینب' داؤد کے لیے ایسے ہی لوگوں میں شامل ہوتی تھی۔ اس کا رونا داؤد کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

"اوکے زینب! آپ بتائیں آپ اس وقت کہاں ہیں؟ میں ابھی آجاتا ہوں آپ کے پاس۔"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جہاں ڈھائی بج رہے تھے۔

"آپ کے پاس اور کون ہے؟ یہ کس کی آواز آ رہی ہے؟ اتنا... اتنا شور کیوں ہے زینب! پلیز... کچھ تو بتاؤ..."

وہ زچ ہو کر بولا تھا۔

"سرو سز ہاسپٹل چلڈرن وارڈ۔"

اس کے ہاتھ سے فون شاید کسی اور نے پکڑ لیا تھا۔ فون ایک دفعہ پھر خاموش ہو چکا تھا۔ داؤد نے بستر سے اتر کر شرٹ پہنی' شہریار کا لحاف درست کیا۔ اے سی آف کر کے وہ عام سلیپر پہنے بھاگتا ہوا باہر آیا تھا۔ گاڑی باہر نکال کر اس نے رات کو آنے والے پہرہ دار کو کچھ ہدایات دی تھیں اور دو منٹ بعد وہ گاڑی لیے سڑک پر رواں دواں تھا۔ ریش ڈرائیونگ کی بدولت بھی وہ پینتالیس منٹ میں ہی ہاسپٹل تک کا فاصلہ طے کر پایا۔

"بچی کو الیکٹرک کرنٹ لگا ہے۔ حالت بہت سیریس ہے۔"

یہ سب اسے ریسپشنسٹ نے بتائی تھی۔ رات کے اس پہر ڈیوٹی پر ایک دو ہی ڈاکٹر موجود تھے جو اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے دو ایک جاننے والوں سے رابطہ کیا کیونکہ اس کے

بغیر ہاسپٹل میں مدد کا مل جانا روایت کے برخلاف ہی تھا۔ اس کی اچھی پی آر کی بدولت تھوڑی ہی دیر میں فون کال کی وجہ سے ڈاکٹر کافی متحرک نظر آنے لگے۔

زینب اسے باہر ایک ڈیسک پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ داؤد کے دل کو پھر کسی نے مسلا۔ وہ کمزور نہیں تھا لیکن جو محبت اس کے دل میں زینب اور ماوی کے لیے پیدا ہو چکی تھی وہ بہت کمزور تھی۔ وہ اڑتا ہوا اس تک آیا۔

"زینب... زینب۔"

اس نے پاس بیٹھ کر دوبارہ پکارا اور تیسری پکار سے پہلے وہ اس کے کندھے سے لگی اس کا مزید امتحان لے رہی تھی۔

"میری ماوی مر گئی داؤد... میری ماوی مر گئی۔"

ہچکیوں کے بعد جو چند الفاظ کانوں میں پڑ سکے اس نے داؤد کے ہوش اڑا دیے۔

"واٹ؟" وہ اسے اپنے کندھے سے ایک جھٹکے سے الگ کر کے اٹھا اور دوبارہ نرس سے تفصیل پوچھنے لگا۔

"شی از سیریس بٹ نوٹ ایکسپائرڈ۔"

بغیر کسی تاثر کے نرس نے رٹا ہوا سبق دہرایا۔ وہ مرے مرے قدموں سے دوبارہ زینب کے پاس آ گیا۔

"ایوری تھنگ از آل رائٹ زینب! فکر مت کیجیے... ماوی ٹھیک ہے۔"

وہ اسے تسلی دے کر بولا۔ زینب جو بے اختیاری میں جذباتی ہو گئی تھی اب قدرے سنبھل چکی تھی۔ رونے کا عمل مسلسل جاری تھا۔

"دعا کرو... انشاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔" وہ چاہ رہا تھا یہ رونا دھونا ختم ہو جائے۔ زینب نے بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تفصیل سے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟" وہ بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

زینب نے روتے ہوئے اسے جو کچھ بتایا اس کے مطابق رات کے کسی پہر ماوی کو پیاس لگی تو وہ اسے جگانے کی بجائے خود پانی پینے کے لیے روم ریفریجریٹر تک بڑھی۔ تاریکی میں اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ سے ٹکرا گیا جہاں کچھ ننگی تاریں تھیں جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی جب اسے کچھ دیر ہو گئی تو زینب نے لائٹ آن کر کے دیکھا تو اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ بہت مشکل سے وہ خاتون کرایہ دار کی مدد سے اسے ہاسپٹل لا سکی تھی۔

"اسفند سمجھے گا میں ماوی کا خیال نہیں رکھتی' وہ سمجھے گا میں اچھی ماں نہیں ہوں۔ وہ سمجھے گا میں ماوی کے معاملے میں کوتاہی کرتی ہوں۔ وہ ماوی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

خاموشی کے اس وقفہ کے بعد اس کے منہ سے نکلنے والے ان فقروں نے داؤد کو جی بھر کے بدمزہ کیا۔

"ماوی تمہاری بیٹی ہے زینب! اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا' کوئی اسے تمہاری مرضی کے بغیر کہیں نہیں لے جا سکتا۔"

اس کے اس قدر استحقاق سے کہنے پر زینب کو کافی تسلی ہوئی... وہ بچوں کی طرح منہ نیچے کر کے بیٹھ گئی۔ داؤد نے غور سے اسے دیکھا وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی شاید دعا مانگ رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی کے بقایا جات موجود تھے' چہرے پر بھی مٹے مٹے آنسوؤں نے اپنے نشان چھوڑ دیے تھے۔ ملگجے کپڑوں میں' کندھے پر ڈوپٹہ ڈالے' بکھری بکھری' زلفوں کے ساتھ وہ کوئی اور ہی زینب لگ رہی تھی۔ داؤد نے اس کا بہت تفصیلی جائزہ لیا تھا۔

"شرم کرو بیٹے! اس عمر میں یہ چونچلے۔"

اس نے اپنی اس حرکت پر خود کو گھرکا' مگر کمبخت نظریں پھر اس کے اردگرد طواف کرنے لگیں۔ مشکل ہوتا ہے' کچھ چہروں سے نظر ہٹا لینا واقعی مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ ان چہروں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوتی مگر ان پر پڑنے پر نظر ان کو خاص سے خاص تر کرتی چلی جاتی ہے۔ داؤد رضا کے پاس زینب کے لیے ایسی ہی نظر تھی۔

"ماوی... ماوی خضر... اس بچی کے ساتھ کون ہے۔"

"میں... میں ہوں۔" نرس کی آواز پر زینب بے تابی سے اٹھی لیکن پھر ایک انجانے خدشے کے تحت، خوفزدہ ہو کر دوبارہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ داؤد نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر بہت محبت اور اپنائیت سے اپنا ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہم... ہم ہیں ماوی خضر کے ساتھ۔"

"یور پیشنٹ از آؤٹ آف ڈینجر ناؤ۔"

نرس کی خوشخبری پر انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کے لمس و حرارت کو مکمل طور پر محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے جیسا شاندار شوہر قسمت والوں کو ملا کرتا ہے، تمہیں تو چاہیے صبح و شام میری نظر اتارا کرو اور ہمہ وقت میری بلائیں لیا کرو... نظر لگ جاتی ہے بھئی۔"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے اسے دیکھتا ہوا بولا، وہ ابھی شیو کر کے باتھ روم سے نکلا تھا اور اب چہرے پر آفٹر شیو لگا رہا تھا۔ زینب نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ عجیب عالم استغراق میں کھوئی ہوئی تھی۔

داؤد نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا تھا لیکن اسے خاموش پا کر دوبارہ بولا۔

"یار! میرا موڈ ہو رہا ہے آج کہیں باہر چلتے ہیں، بہت دن ہو گئے بچوں کو اور تمہیں کہیں آؤٹنگ کروائے ہوئے۔" وہ بات کرتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا تھا، زینب ابھی بھی سابقہ پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

"تم وہ رائل بلیو والی ساڑھی پہنو پلیز، میں بھی تمہاری پسند کے کپڑے پہن لیتا ہوں۔ ڈنر تمہاری فیورٹ جگہ سے کریں گے... کینڈل لائٹ... ٹھیک ہے؟"

زینب ویسی ہی گھٹی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ڈنر کے بعد لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔ میوزک بھی سنیں گے۔ میری پسند کا سانگ۔"

وہ گانا زینب کو سخت ناپسند تھا، داؤد نے جان بوجھ کر اس سنگر کا نام لیا تھا تاکہ وہ چپ کا روزہ توڑ کر کچھ بولے تو سہی لیکن وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی تھی۔

"اچھا بابا... اچھا... تمہاری پسند کا گانا سن لیں گے۔ اے جذبہ دل گر میں چاہوں" ٹھیک؟"

زینب کے چہرے پر بہت پھیکی سی مسکراہٹ آئی تھی، داؤد نے گہرا سانس بھرا۔

"چلو میں تمہیں اچھا سا لطیفہ سناتا ہوں۔ ایک پاگل پاگل خانے سے..."

"داؤد پلیز! یہ بکواس لطیفہ جس میں پاگل غلیل بنا کر چڑیا مارنا چاہتا ہے، آپ نے اتنی دفعہ مجھے سنا دیا ہے کہ اب اس پر ہنسی نہیں آ سکتی صرف رونا آ سکتا ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر اکتا کر بولی۔ داؤد نے اس کے انداز کا بغور جائزہ لیا۔

"یار بیوی! تمہارا سینس آف ہیومر روز بروز بگڑتا جا رہا ہے۔"

داؤد نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔ زینب ایک بار پھر خاموش ہو چکی تھی۔

"داؤد!" اس نے جس انداز میں پکارا داؤد سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

"داؤد! کیا... سچ مچ اسفند واپس آ گیا ہے؟"

اس کی آواز میں عجیب طرح کا کرب تھا اور یہی کرب داؤد کو درد میں مبتلا کرتا تھا۔

"کیا یہ مجھ سے شادی پر خوش نہیں ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

"زینب! اسفند کو ایک نہ ایک دن تو واپس آنا ہی تھا۔ تم اس کا سامنا کرنے سے ڈرتی کیوں ہو؟ کیا چیز ہے جس سے تم خائف ہو؟ وہ خود تمہیں اور ماوی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا تم دونوں سے کنارہ کشی اس نے اختیار کی تھی، ڈرنا تو اسے چاہیے، خوفزدہ تو اسے ہونا چاہیے۔"

وہ ذرا کی ذرا اکتا کر اسے سمجھانے لگا۔ جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ اسفند پاکستان واپس آ چکا ہے، وہ

وسوسوں کا شکار تھی۔ اس کے سارے وجود پر پژمردگی اور پژمردگی کا پہرہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اب بھی داؤد کی بات سن کر وہ سر بھی نہ اٹھا سکی بلکہ داؤد کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔

"وہ ماوی کو اپنے ساتھ تو نہیں لے جائے گا داؤد!"

داؤد نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بیچارگی سے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"نہیں میری جان! وہ اسے اپنے ساتھ کیسے لے جا سکتا ہے؟ وہ اس کی نہیں تمہاری بیٹی ہے... وہ ہماری بیٹی ہے زینب!... اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا... بی ریلیکس... میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔"

وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تو پھر انہوں نے آپ سے شادی کر لی۔" اسفند کی آواز سے آگ نکل رہی تھی جس کی لپیٹیں داؤد کو اپنے چہرے تک آتی محسوس ہوئیں۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا وہ اے سے زیڈ تک ایک ایک بات اسے بتا چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اسفند اپنی غلطی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ نا صرف صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرے گا بلکہ ایکسکیوز بھی کرے گا کیونکہ وہ بیوقوف نہیں تھا لیکن ساری بات سننے کے بعد جب وہ بولا تو داؤد کو احساس ہوا کہ وہ بیوقوف ہی نہیں بدتمیز بھی ہے۔

"تو پھر انہوں نے آپ سے شادی کر لی۔"

داؤد کی سماعتوں نے پھر یہی الفاظ سنے۔

"نہیں... بلکہ میں نے اس سے شادی کر لی۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔" اسفند استہزائیہ ہنسی ہنس کر بولا۔

"نہیں، ایک بات نہیں ہے۔ یہ دونوں بہت مختلف باتیں ہیں اور ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔"

"میں اس فرق کو تسلیم نہیں کرتا۔"

"زمین گول ہے۔ بہت سے لوگ اس بات کو بھی نہیں مانتے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زمین گول ہی رہتی ہے چوکور نہیں ہو جاتی۔"

"بہت خوب۔ یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی اور زینب کی شادی ایک یونیورسل ٹروتھ ہے۔"

"نہیں... میں یہ نہیں کہنا چاہتا... لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور یہ ایک یونیورسل ٹروتھ ہی ہے۔"

داؤد کے الفاظ و انداز میں متحمل ہی تحمل تھا۔

"میں جانتا ہوں آپ نے ایسے اور بھی بہت سے اقوال زریں یاد کر رکھے ہوں گے جو آپ کے ملٹی ڈائی مینشنل لو افیئر کو جسٹی فائی کر سکیں۔"

"شٹ اپ اسفند! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

لفظ ملٹی ڈائی مینشنل نے اسے حد سے زیادہ سلگایا تھا۔

"میں حد سے نہیں بڑھ رہا... میں تو صرف کوشش کر رہا ہوں... آپ نے تو ہر حد پار کر لی ہے۔"

داؤد نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔ وہ لڑکا اس کی قوت برداشت کا امتحان لے رہا تھا۔

"ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ اسفند! تم کیا سمجھتے ہو، یہ شادی کسی لو افیئر کا نتیجہ ہے؟ کیا میں نے زینب کو یا زینب نے مجھے محبت کے واسطے دے کر شادی پر مجبور کیا؟ نہیں... نہیں میرے بھائی! ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو ایک ڈیل ہے، ایک ایگریمنٹ ہے۔ ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو والی بات ہے۔ کچھ عرصہ پہلے نظریہ ضرورت کے سارے اصول تم نے ہی تو مجھے ازبر کروائے تھے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ ضرورت کے تحت ہر کام کیا جا سکتا ہے۔ خضر صاحب کی وفات کے بعد تم نے تو زینب کو لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا تھا۔ وہ اکیلی..."

"داؤد بھائی! میں صرف ملک چھوڑ کر گیا تھا۔ میں مر تو نہیں گیا تھا۔ مجھے لوٹ کر یہاں ہی آنا تھا، زینب کے پاس ماوی کے پاس۔"

اس کا لہجہ اب کی بار بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

"تم اپنی غلطیوں کو کتنے آرام سے نظر انداز کرتے

جا رہے ہو۔ تم اپنی ذمہ داری بھول کر یہاں سے سب سمیٹ کر چلے گئے' سب کچھ بیچ باچ کر' سارا سرمایہ سنبھال کر۔۔۔ اور وہ اکیلی عورت کب تک دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی۔ تمہیں احساس ہے کہ اکیلا انسان۔۔۔ خاص طور سے اکیلی عورت کا اس معاشرے میں تن تنہا سروائیو کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔"

داؤد کا انداز قدرے طنزیہ تھا۔

"وہ اکیلی کب تھیں؟ آپ جو تھے ان کے ساتھ۔"

اسفند نے ثابت کیا کہ اس کے پاس بھی طنز کے وار کرنے کے لیے کافی کچھ ہے۔

"ہاں۔۔۔ میں تھا اس کے ساتھ۔ جب اپنے سپنے توڑ دیتے ہیں تو غیر ہی آگے بڑھ کر اپنوں کا کردار نبھاتے ہیں۔۔۔ نا صرف اپنوں کا کردار نبھاتے ہیں بلکہ اپنے بن کر بھی دکھاتے ہیں۔"

داؤد بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"زینب اکیلی تھی اسے معاشرے میں عزت کے ساتھ جینے کے لیے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے ضرورت تھی ایک ایسی چھت کی جس کے نیچے وہ ایک آسودہ زندگی گزار سکے۔ مجھے ضرورت تھی ایک ایسے ستون کی' جس کے سہارے میری زندگی کی عمارت کھڑی ہو سکے۔ میرا مکان گھر بن سکے۔ تم سے زیادہ بہتر یہ سب کون جانتا ہے کہ مجھے کس کس چیز کی ضرورت تھی۔ تم نے ہی تو مشورہ دیا تھا کہ دوسری شادی میرے تمام مسائل کا حل ہے۔"

"میں ہی احمق' میں ہی پاگل۔۔۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں آپ نے جو کیا وہ میری خواہش کے تحت کیا۔"

اسفند نے اکتا کر کہا۔ داؤد خود بھی اس بحث برائے بحث سے اکتانے لگا تھا۔ اسفند اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

"میں ایسا کیوں کروں گا؟ بولو اسفند' میں ایسا کیوں کروں گا؟ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے تمہاری خواہش کے تحت ایسا کچھ نہیں کیا لیکن زینب نے یہ سب تمہاری سازش کے تحت ہی کیا۔"

"واٹ۔۔۔ آپ اسے سازش کہہ رہے ہیں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر استفہامیہ انداز میں بولا۔

"یہ سازش نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ بینک سے تمام رقم نکلوا کر لے جانا' آفس کا دفتر بیچ کر بزنس روک دینا' اسٹاف کو فارغ کر دینا' اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دینا اور۔۔۔ یہاں سے فون جانے پر بات نہ کرنا۔ کبھی کوئی رابطہ نہ کرنا' کیا کہتے ہیں اسے تمہاری زبان میں؟۔۔۔ سازش؟ یا۔۔۔ رحمتوں کی بارش۔"

داؤد کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔

"ویری گڈ اینڈ ویری انٹرسٹنگ۔۔۔ آپ فلموں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کر دیجیے کافی اچھے پلاٹ میکر ہیں آپ۔۔۔ میرے بینک سے ساری رقم خود نکلوا کر میرا نام لگا دینا' میرے آفس کو سیل کر کے سب کچھ خود کے قبضے میں کر لینا اور فون کرنے پر ریسیو نہ کرنا۔ یہ سب بھول گئے آپ؟ اسے آپ کی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ خدا ترسی؟۔۔۔ ہمدردی یا لالچ۔"

یہ سب کہتے ہوئے ایک استہزائیہ سی ہنسی اس کے چہرے پر تھی۔ داؤد نے حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ زینب کو اسی لیے نہیں لایا تھا کہ اسفند کی تلخ باتوں سے وہ خوامخواہ پریشان ہوتی۔

"تم پاگل ہو چکے ہو؟ تمہیں یہ سب ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی غلطیوں پر ایکسکیوز کرنے کے بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اس حد تک خود غرض ہو چکے ہو کہ اپنا کیا دھرا کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کرو گے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ' جب لوگوں کے باپ مرجایا کرتے ہیں وہ پاگل ہی ہو جاتے ہیں۔ انہیں اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ وہ سچ مچ۔ سچ مچ۔۔۔"

وہ یکدم خاموش ہو گیا تھا' داؤد نے اس کی بھرائی ہوئی خاموشی کو محسوس کیا۔ اسفند شاید رونے لگا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ ٹیبل کی چکنی سطح کو گھور رہا تھا۔ چند لمحوں بعد داؤد نے اسی چکنی سطح کو نم ہوتے دیکھا۔

"گزشتہ چار ماہ اپنوں سے دور رہ کر میں نے سیکھا کہ

میں تو ان کے بغیر نہیں رہ سکتا میں رہ ہی نہیں سکتا داؤد بھائی! اسی لیے میں لوٹ آیا اپنوں کے پاس' وہ اپنے جو اپنے رہے ہی نہیں۔ مجھے دولت کی حاجت نہیں ہے داؤد بھائی! روپے پیسے جتنے میرے تھے اتنے ہی زینب اور ماوی کے تھے لیکن زینب نے جو کیا۔۔۔ آپ نے جو کیا۔۔۔ آپ مجھ سے مانگ لیتے' زینب ایک بار کہہ دیتیں تو میں ساری پراپرٹی ماوی کے نام کر دیتا۔۔۔ اپنا حصہ بھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ میری انگلیاں تھک جایا کرتی تھیں فون ملاتے ملاتے لیکن یہاں۔۔۔ یہاں کوئی میرے فون سننے کا بھی روادار نہیں تھا۔"

وہ روتے ہوئے کہنے لگا تھا۔ وہ بڑا لگتا تھا' بڑا تھا نہیں' اندر سے وہ انیس سال کا ایک امیچور لڑکا ہی تھا۔ داؤد کو اس کے بے ربط فقروں سے ایک نئی ہی داستان کے اشارے مل رہے تھے۔

"اسفند! تم نے پاور آف اٹارنی کس کے نام کی بنوائی تھی۔۔۔ آسٹریلیا جانے سے پہلے؟" اس نے پوچھا۔ اسفند عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں پاور آف اٹارنی زینب ہی کے نام تھی۔ ماموں نے وہاں سے خود تمام پیپرز یہاں منیجر کو بھیجے تھے۔ ماموں کا فونز اور میلز کے ذریعے منیجر سے رابطہ تھا مگر پھر یکدم ہی زینب بھی غائب ہو گئیں اور منیجر بھی۔"

"ایک منٹ اسفند! منیجر کس کے بھروسے کا آدمی تھا؟ کیا وہ تمہارے فادر کا ٹرسٹ وردی آدمی تھا؟"

"نہیں۔۔۔ غیور صاحب ماموں کے بہت اچھے دوست اور برادران لاہیں۔"

اسفند نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔ داؤد کو سب کچھ سمجھ آ رہا تھا۔ جگسا پزل کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے' انہیں ارینج ہی تو کرنا تھا پھر سارا معاملہ روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا۔ اس نے اسفند کو پھر سے سب تفصیل بتانی شروع کی تھی' کیسے یہاں سے یکدم آفس کو بند کر دیا گیا تھا' بینک اکاؤنٹ کا خالی ہونا' پھر زینب کے چھوٹے چھوٹے مسائل۔۔۔ محلے والوں کی چہ میگوئیاں وہی تمام باتیں تھیں جو اس طرح کے کیس میں ہو سکتی ہیں لیکن اب کی بار اسفند کے ساتھ زیر بحث لاتے ہوئے اس نے مجرم کے کٹہرے میں اسفند کے ماموں کو رکھا تھا۔ سب ہی کچھ واضح ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ تفصیل سے ڈسکس کرنے کی دیر تھی۔ جسے وہ قسمت کی سازش سمجھ رہے تھے وہ اصل میں محترم ماموں جمع منیجر کی سازش تھی۔

"اپنے ہی سپنے توڑ دیتے ہیں۔" اسفند کو ساری بات سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس نے بجھے ہوئے دل سے داؤد سے کہا تھا۔ داؤد نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ نئے رشتے بن بھی سکتے ہیں اور قائم بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کے سگے ماموں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔ انہوں نے بدلے کے طور پر اپنی بگڑی ہوئی بیٹی اسفند کی جھولی میں ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن اسفند کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے انکار سے ماموں' ممانی کا رویہ دن بدن بدلنے لگا تھا۔ اسی لیے اسفند واپس آ گیا تھا۔ اس نے تمام تفصیل سے داؤد کو آگاہ کیا تھا۔ کڑیاں' کڑیوں سے مل کر ایک نئے قصے کو جنم دینے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بہت محبت سے نئے سرے سے گلے شکوے کر رہے تھے۔ ایک نئی' مختلف زندگی ان کی منتظر تھی۔ اسفند کے گھر سے داؤد کے گھر جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے پلان کیا تھا کہ اب انہیں کس قسم کی قانونی کارروائی کرنی ہے' کرنی بھی ہے یا نہیں کرنی۔ داؤد نے اسے زینب کو پرپوز کرنے سے لے کر شادی تک کی تمام تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

زینب ماوی اور شہریار کو فون کے ذریعے بتا دیا گیا تھا اور وہ بہت بے چینی سے گھر میں ان کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

یہ نومبر کی ایک خنک شام کا منظر تھا' عصر کی اذان کو بمشکل آدھ گھنٹہ گزرا تھا مگر ماریکی ابھی سے اپنا مہین لبادہ اوڑھے روشنی کو نگلنے کے لیے پر تول رہی تھی خنکی تھی مگر اتنی نہیں کہ انسان ٹھٹھر کر گھروں میں محصور ہو جائیں۔ ایسے ٹھنڈے میٹھے موسم کو انجوائے

کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ لوگ تین سے چھ والا شو دیکھنے کے بعد او جی بھر کر بد مزہ ہونے کے بعد پراہٹ کی طرف جا رہے تھے۔

"نہیں آخر تم لوگ مجھے یہ بتاؤ' اتنا اسٹوپڈ آئیڈیا تھا کس کا؟"

ڈرائیور سیٹ پر داؤد رضا صاحب براجمان تھے چونکہ اس سارے بکھیڑے کے ذمہ دار بھی وہی تھے اس لیے اپنی شریک حیات کے اس سوال پر وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتا رہا۔

"داؤد بھائی! معزز خاتون آپ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور آپ خاموشی سے سن رہے ہیں۔ یہ حقوق نسواں کی خلاف ورزی ہے۔ پارلیمنٹ کا اگلا دنگل اسی سوال کو لے کر ہو گا۔"

اسفند نے گوہر افشانی کی وہ داؤد کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اسے بھی باقی تمام لوگوں کی طرح فلم نہایت بکواس لگی تھی۔ داؤد کا برتھ ڈے تھا اور ذرا مختلف طریقے سے منانے کے چکر میں وہ سینما آ گئے تھے۔ اسفند کو اس کی من پسند جگہ پر ٹریٹ دینے کا وعدہ کر کے داؤد نے دو ووٹ اپنی طرف کر لیے تھے۔ زینب بیچاری تین میں نہ تیرہ میں' وہ سب جی بھر کر اور اجتماعی طور پر بور ہوئے تھے۔

"کسی نے با جماعت بور ہونا ہے تو سینما آ کر پاکستانی فلم دیکھ لے۔" زینب بولی۔

"شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو' پاکستانی فلم دیکھتے ہوئے کیسی بری بری شکلیں بنتی ہیں۔ فلمیں کلچر کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ فلموں کے ذریعے ہم اپنا کلچر ایکسپورٹ کرتے ہیں۔" داؤد نے انہیں غیرت دلائی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ٹھنڈی آہوں' بڑکوں اور ڈھمکوں کو ایکسپورٹ کرنے سے کتنی رقم مل جاتی ہو گی؟ ہم صدر بش سے اپیل کرتے ہیں کہ یہ ڈھمکے اور ڈھول لے کر ان کے بدلے ہمیں F-16 دے دے۔"

اسفند کو ہمیشہ الٹی ہی سوجھتی تھی۔ نہایت سنجیدہ انداز میں عرض کیا گیا تھا۔

"تم تو خاموش ہی رہو برٹنی اسپیئر کے عاشق! تم سے زیادہ بڑا غدار... شٹ" گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور داؤد کی زبان بھی۔

"مبارک ہو... انجن میں کوئی فالٹ ہے۔" وہ گاڑی کے انجن کو چیک کر کے دوبارہ گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا موڈ بری طرح آف ہوا تھا۔

"مجھے بتایئے اس کا ذمہ دار کون ہے۔" اسفند نے ایک اور شوشہ چھوڑا پھر داؤد کے گھورنے پر جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے یورپ میں سب ایسا ہی کہتے ہیں' شرٹ کی سلائی بھی ادھڑ جائے تو بیچارا ایک شخص قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔"

"میرا تو ذاتی خیال ہے ان صاحب کو بھی اپنے کارناموں کی اطلاع بی بی سی اور سی این این کے ذریعے ملتی ہو گی۔ ٹی وی آن کر کے خود سے کہتے ہوں گے' اوہ... اچھا آج میں نے یہ کیا ہے۔"

زینب نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ماشاء اللہ... ماشاء اللہ' آپ کی زیرک نگاہی کا کیا کہنا' انٹرنیشنل افیئرز پر آپ کا یہ تجزیہ کسی بھی طرح سے نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔"

اسے گاڑی کے بیچ رک جانے پر از حد افسوس تھا اسی لیے جل کر بولا۔

"اب کیا کریں گے؟" زینب جو ماوی اور شہریار کے بیچ بیٹھی تھی' پریشان ہو کر بولی۔

"دہشت گردی اور اسمگلنگ... آج کل یہی دو پروفیشن ٹرینڈ میں ہیں۔ عزت بھی ہے اور پیسہ بھی' روز ٹی وی پر آنے کا چانس بھی بن سکتا ہے۔ کام کم اور نام زیادہ پی آر بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں پر بیٹھے بیٹھے سارے یورپ میں آپ کے نام کا ڈنکا بج سکتا ہے۔ ایک شخص کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ خود کہاں ہے اور اس کا ذکر کہاں کہاں ہے؟" اسفند خود ہی مزا لے کر بولا۔

"اوئے' تم یہ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟" داؤد اس کی بکواس سے چڑ کر بولا۔

آؤٹیں... یہ تو کی ٹرینڈ لیں ہے۔

وہ لوگ کینال ویو کے کنارے کھڑے تھے۔ وقت بھی اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن بڑھتے ہوئے جرائم کی بدولت کوئی اپنی گاڑی روک کر ان کی مدد کو تیار نہیں تھا۔ داؤد تو گاڑی سے باہر ہی کھڑا تھا جبکہ وہ باقی لوگ اندر ہی تھے۔

"ایک تو یہ مکھیاں..." داؤد منہ کے آگے ہاتھ لہرا کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"مکھیاں بہت اہم ہیں۔ آپ کو پتا ہے چین میں مکھیاں مار کر انہیں بیچ دو تو روپے ملتے ہیں۔ پندرہ روپے فی کلو۔" اسفند پھر شروع ہوا۔

"ہائیں... مکھیوں کا کیا کرتے ہوں گے؟" زینب کی آواز میں تحیر تھا۔

"کرنا کیا ہے؟ ان کو پیس کر سفوف بنائیں گے۔ ڈبے میں بند کریں گے۔" اسمارٹ اور خوب صورت بنیے۔" کا ٹیگ لگائیں گے اور دی موسٹ انٹیلی جینٹ پاکستانی قوم کو بھیج دیں گے اور کمائیاں کریں گے۔"

اسفند کا انداز جلا ہوا تھا۔ وہ آج کل پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی ڈھونڈ رہا تھا اس لیے اخبار روز پڑھنا پڑتا تھا۔ روز اخبار پڑھنے والے ایسی ہی جلی ہوئی گفتگو کرتے ہیں۔

"یہ تو حال ہے ہماری قوم کا' دل بد صورت ہو چکے ہیں اور ظاہری خوب صورتی کو نکھارنے کے لیے ہر نسخہ آزمانے کو تیار ہیں۔"

داؤد نے بھی تاسف سے کہا۔

"ٹی وی آن کر لو تو اشتہارات کی بھرمار ہے۔ گھر سے باہر نکل آؤ تو دیواریں رنگین کر رکھی ہیں "آیئے آپ کو خوب صورت بنا دیں۔" آیئے آپ کو نوجوان بنا دیں۔"

"آیئے آپ کا قد لمبا کر دیں۔" زینب نے سو فیصد سچی بات کی۔

"آپ لوگ قوم سے اتنے بد دل کیوں ہیں؟ دن دوگنی رات چوگنی ترقی تو ہو رہی ہے۔ ہم Fiat اور Balino ایں بنائے یا چنگ چی اور سائیکل رکشہ تو ماشاء اللہ ہماری اپنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جہاز نہیں بنتے تو کیا ہوا' گلیاں رات کو جہازوں (عادی نشئی) سے آباد رہتی ہیں۔ ہمارے ہونہار سیاست دان دن رات پارلیمنٹ میں ان تھک محنت کے بعد بیوقوف بنانے کے نت نئے طریقے دریافت کرتے ہیں۔ یہ سب تو امریکہ کے تھنک ٹینکس بھی نہیں کرتے ہوں گے۔ اب اتنا سب کچھ ہو رہا ہے تو تھوڑا ٹائم جوان اور خوب صورت بننے پر لگ بھی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

وہ اتنے سنجیدہ انداز میں اتنی بے تکی بات کر رہا تھا کہ جھنجلاہٹ کے باوجود داؤد اور زینب ہنس دیے۔

"اسفند تم بھی کمال کرتے ہو۔" داؤد نے کہا۔

"ابھی اور بھی کمال کروں گا۔ آپ ذرا چابی دیں۔"

اس کے ہاتھ سے چابی لے کر اس نے ڈگی سے پانی کی بوتل نکالی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ انجن گرم ہو چکا ہے۔ اتنی دیر اسے ٹھنڈا کرنے کو کافی تھی۔ بونٹ کھول کر تفصیلی جائزہ اور ضروری علاج معالجہ کر کے وہ واپس گاڑی میں آ گیا۔

"اب اسٹارٹ کیجئے۔" اس نے چابی داؤد کو تھما کر کہا۔ گاڑی سچ مچ اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

"پہلے نہیں بتا سکتے تھے کہ انجن گرم ہے۔" داؤد نے گھور کر کہا۔ وہ شرارت سے ہنس دیا۔ زینب بھی ہنس رہی تھی۔ تھوڑی سی دیر بعد یہ ہنستا مسکراتا قافلہ پراہٹ پہنچ گیا تھا۔ اسفند اور شہریار مل کر اونچی آواز میں گا رہے تھے۔

"یہ بل آپ کا ہوا... یہ بل آپ کا ہوا۔"

خوشی باندی بنے ان کے آگے کھڑی تھی۔ یہی قسمت کا کھیل ہے۔ کبھی آنسو' کبھی ہنسی' کبھی تاریکی' کبھی اجالا۔ یہی زندگی کے اصول ہیں۔ جو پہیے کے نیچے آتا ہے وہ کبھی پہیے کے اوپر بھی ہوتا ہے۔ یہی زیست کے کھیل ہیں۔

زندگی کو دوام ہے' انسان کو نہیں اسی لیے لوگ مر جاتے ہیں' زندگی زندہ رہتی ہے۔

✡ ✡